دعوت دین
کا
انبیائی طریق کار

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

بھٹکے ہوئے انسانوں کو سیدھی راہ دکھانا، انھیں اللہ کے دین کی طرف بلانا، ان تک حق کا پیغام پہنچانا اور انھیں معروفات کا حکم دینا اور منکرات سے روکنا، ان کاموں کی ضرورت واہمیت ہر دور میں محسوس کی گئی ہے اور انھیں امتِ مسلمہ کے فرائضِ منصبی میں شمار کیا گیا ہے۔ چناں چہ علمائے حق نے اپنے مواعظ وارشادات اور خطبات وتصنیفات میں اس پہلو پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے اور اس کے اصول وآداب پر بہت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ ماضی قریب میں اس موضوع پر عرب دانش وروں کے قلم سے چھوٹی بڑی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں، جن کے اردو زبان میں ترجمے بھی ہو گئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی 'اصول الدعوۃ' (اصولِ دعوتِ دین)، شیخ بہی الخولی کی 'تذکرۃ الدعاۃ' (تحریک اور دعوت)، شیخ عبدالبدیع صقر کی 'کیف ندعو؟' (ہم دعوت کا کام کیسے کریں) اور ڈاکٹر فتحی یکن کی 'کیف ندعو الی الاسلام؟' (دعوت وتبلیغ کے رہ نما اصول) قابلِ ذکر ہیں۔ اردو زبان میں برصغیر ہند وپاک میں اور خاص طور پر تحریکی حلقے میں عرصے سے دو کتابیں بہت معروف اور متداول ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تصنیف 'دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار' ہے۔ اس کتاب میں دعوت کے محدود اور غلط مفہوم اور مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے انبیائے کرام کی دعوتی مساعی کے حوالے سے صحیح طریقۂ دعوت وتبلیغ کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کے تقاضوں اور مراحل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر بات کی بنیاد قرآن حکیم کے محکم دلائل پر رکھی گئی ہے۔ دوسری کتاب جماعت اسلامی ہند کے موجودہ امیر اور صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیف 'اسلام کی دعوت' ہے۔ اس کتاب میں بہت

مؤثر، دل نشیں اور شستہ اسلوب میں کارِ دعوت کی اہمیت و عظمت، اس کے اصول و آداب، طریقۂ کار، میدانِ دعوت میں کام کرنے والوں کے ضروری اوصاف اور دعوت کے لیے تنظیم کی ضرورت جیسے موضوعات پر کتاب و سنت کی روشنی میں عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کی پیش نظر کتاب بھی اس موضوع پر ایک مفید اضافہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے انھی میں سے کچھ انسانوں کو منتخب کیا اور انھیں اپنا نبی اور رسول بنایا۔ دعوتِ دین انبیائے کرام کا مشن رہا ہے۔ انھوں نے بہ راہِ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اس کام کو انجام دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دعوتِ دین کا وہی طریقۂ کار اختیار کیا جائے جو انھوں نے اختیار کیا تھا، انھی آداب کی رعایت کی جائے جو انھوں نے ملحوظ رکھے تھے اور وہی صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں جن سے ان کی پاکیزہ زندگیاں مزیّن تھیں۔

زیرِ نظر کتاب میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر شگفتہ اسلوب اور عالمانہ استدلال کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ابتدا میں دعوت کی اہمیت اور ماہیت کی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایک داعی کے اندر کیا بنیادی اوصاف ہونے چاہئیں؟ پھر دعوتِ دین کے انفرادی اور اجتماعی طریق ہائے کار کی الگ الگ وضاحت کی گئی ہے اور انبیائے کرام اور اصحاب رسول کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اگلی بحث اقامتِ دین کے عنوان سے ہے۔ فاضل مصنف نے آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دین کا اطلاق عقائد پر بھی ہوتا ہے اور عبادات پر بھی۔ اس کے علاوہ قانونِ حلت و حرمت اور حدود و تعزیرات بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ غرض پوری انسانی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے کا نام دین ہے اور اس کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی ذات پر بھی قائم کیا جائے اور تعلیم و تلقین کے ذریعے دوسروں کو بھی اس کا پابند بنایا جائے۔ ایک باب میں انبیائے کرام کی دعوتی سرگزشت بیان ہوئی ہے اور اس ضمن میں احکامِ دین میں جو تدریج رہی ہے اسے نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک بحث مصنف نے استخلاف کے موضوع پر کی ہے۔ استخلاف کا مطلب ہے روئے زمین کے اقتدار کا مالک ہونا۔ یہ اقتدار کبھی اللہ کے نیک بندوں کو حاصل ہوتا ہے اور کبھی ظالموں اور فسادیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، لیکن دونوں میں بیّن فرق ہے۔ نیک بندے جب حکومت و اقتدار پر فائز ہوتے ہیں تو دنیا میں خیر و برکت عام ہوتی ہے، جب کہ اشرار اسے فتنہ و فساد کو پھیلانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ آخری باب کا عنوان

ہے 'جہاد'۔ اس مسئلے میں مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر دنیا میں اللہ کا قانون نافذ ہونے کی راہ میں باطل قوتیں مزاحم ہوں تو ان سے جہاد کرنا بھی دین ہے۔ ان کے بہ قول انبیاء کے طریقۂ کار میں جہاد بھی شامل رہا ہے۔ اگر چہ موجودہ حالات میں اس کی حیثیت تاریخی اور علمی بن کر رہ گئی ہے، لیکن دین کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوتا، وقت ضرورت اس پر عمل لازم ہوگا۔ انھوں نے جہاد کے مفہوم اور مقاصد کی وضاحت کے ساتھ دفاعی جنگ کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، نیز اسلامی جنگوں کا موازنہ موجودہ دور کی جنگوں سے کرکے ثابت کیا ہے کہ عصر حاضر کی جنگوں میں جتنی بڑی تعداد میں انسانی جانیں ضائع ہوئی ہیں، ان کے مقابلے میں اسلامی جنگوں کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی (پ: ۱۹۳۲) جو عرصہ سے مشہور صنعتی شہر بھیونڈی میں مقیم ہیں، اگر چہ پیشۂ طب سے وابستہ ہیں، لیکن اسلامیات اور اردو ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے علمی و تحقیقی مضامین سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ، ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی، سہ ماہی مطالعات نئی دہلی، سہ ماہی افکار عالیہ مئو، ماہ نامہ برہان دہلی، سہ ماہی اقبال ریویو لاہور وغیرہ اور ادبی و تنقیدی مضامین سفیر نعت کراچی، سہ ماہی نوائے ادب ممبئی، ماہ نامہ پیش رفت نئی دہلی وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ان کے علمی و تحقیقی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب دعوتِ دین کے خط و خال نمایاں کرتی، اس کے مطلوبہ طریقۂ کار کی وضاحت کرتی اور قارئین کو عمل پر ابھارتی ہے۔ امید ہے راہِ دعوت میں کام کرنے والے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

محمد رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ
۹ر شوال ۱۴۳۰ھ - ۲۹ر ستمبر ۲۰۰۹ء

باب اول

دعوتِ دین - ایک اہم ایمانی فریضہ

دعوت کیا ہے؟

دعوت دین، جسے قرآن نے شہادت علی الناس کا عنوان دیا ہے، ایک ایسا فریضہ ہے، جس کے مکلّف تمام انبیائے کرامؑ رہے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (آل عمران:۸۱،۸۲)

”یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج میں نے تمھیں کتاب اور حکمت سے نوازا ہے۔ کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے، جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا، کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمے داری اٹھاتے ہو؟ انھوں نے کہا، ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ اس کے بعد، جو اپنے عہد سے پھر جائیں وہی فاسق ہیں۔“

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ص وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (الاحزاب:۷)

''(اے نبیؐ) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو، جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے۔ تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ سے بھی۔ ہم سب سے پختہ عہد لے چکے ہیں۔''

بنی اسرائیل میں شہادت حق کا یہ فریضہ انبیائے کرامؑ ادا کیا کرتے تھے، جو تسلسل کے ساتھ ان کے درمیان مبعوث ہوے۔ (۱) لیکن چوں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر نبوت اور رسالت کا اتمام ہوگیا، (۲) اس لیے اب یہ فریضہ امت مسلمہ کے سپرد ہو گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَ جَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۵ مِنْ قَبْلُ وَ فِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ج صلے (الحج:۷۸)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے۔ اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔''

رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَءًا سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ. (۳)

''اللہ اس کو شاد کام رکھے جو ہم سے کچھ سنے اور اسے بے کم و کاست دوسروں تک پہنچا دے، کیوں کہ بہت سے جن کو پہنچایا جاتا ہے سننے والوں سے زیادہ حفظ و ضبط کے مالک ہوتے ہیں۔''

حجۃ الوداع کے موقعے پر حکم دیا:

لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعٰى لَهُ مِنْهُ. (۴)

''جو موجود ہے وہ غیر حاضر لوگوں کو (یہ خطبہ) پہنچا دے کیوں کہ ان میں ایسے بھی ہوسکتے ہیں، جو حفظ وضبط میں ان سے بہتر ہوں۔''

دعوت دین کا کام یوں تو تمام انبیاء میں مشترک رہا ہے لیکن اللہ نے اس سلسلے میں دو نبیوں کو بہ طور نمونہ پیش فرمایا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب:۲۱)

''یقیناً تمھارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ ہر اس شخص کے لیے، جو اللہ اور یوم آخرت کی توقع رکھتا ہے، اور بہ کثرت اللہ کو یاد کرتا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے فرمایا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ (الممتحنہ:۴)

''مسلمانو! تمھارے لیے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے۔''

جب آپ اور آپ کے ساتھیوں نے شرک سے براءت کا اظہار کیا تو اللہ نے دوبارہ فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ (الممتحنہ:۶)

''یقیناً تمھارے لیے ان میں اچھا نمونہ ہے (خاص کر ہر اس شخص کے لیے) جو اللہ کی اور یوم آخرت کی ملاقات پر ایمان رکھتا ہو۔''

نمونہ اس کو کہا جاتا ہے، جس کی مطلق پیروی کرنا مطلوب ومقصود ہو۔ حضرت ابراہیمؑ اور محمد ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے نمونۂ واجب الاتباع بنایا تو ہمارے لیے ضروری ہوگیا کہ دیگر اعمال صالحہ کی طرح ہم شہادت حق کے معاملے میں بھی ان کی پیروی کریں۔ ذیل کی گفتگو ان

انبیائے کرام کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے طریق تبلیغ سے متعلق ہوگی، جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ حسب موقع بائبل سے تائیدی یا تنقیدی تقابل بھی ہوگا۔

دعوت دین میں جب انبیائی طریق کار کی بات آتی ہے تو ایک بات ابتدا میں سمجھ لینی ضروری ہے کہ انبیاء کا طریق کار اختیاری نہیں بلکہ توقیفی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے مختلف مدارج و مراحل میں طریق کار کی منصوبہ بندی انبیاء خود نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىۙ (النجم:٣،٤)

''اور (یہ رسول) اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کرتا، وہ تو صرف وحی ہے، جو نازل کی جاتی ہے۔''

عمل کے بارے میں اللہ فرماتا ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر:٥)

''تم نے کھجوروں کے جو درخت کاٹ ڈالے یا جنھیں تم نے ان کی جڑوں پر باقی رہنے دیا یہ سب اللہ تعالیٰ کے فرمان سے تھا۔''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰىۚ (الانفال:١٧)

''اور (اے پیغمبرؐ) جب تم نے (دشمنوں کی طرف خاک) پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ (دراصل) اللہ نے پھینکی۔''

واضح رہے کہ دعوت دین کا طریق کار انبیاءؑ کے لیے تو بے شک توقیفی تھا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طریقے پر عمل کرنے کے پابند تھے، لیکن اب امت مسلمہ کے لیے یہ کام توفیقی (اختیاری) ہے۔ کیوں کہ دعوت کے ہر مرحلے کے لیے اب ہمارے پاس اللہ کی واضح ہدایات اور انبیائے علیہم السلام کا اسوہ موجود ہے۔

داعی کے بنیادی اوصاف

انبیاء کے کردار کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کے اخلاق میں بڑی جامعیت نظر آتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھی دو پیغمبروں کو نام بہ نام نمونہ واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ لیکن دعوت دین کے طریق کار میں دوسرے انبیاء کے کردار سے بھی ہمیں رہ نمائی ملتی ہے۔

(۱) مقصد کی صحت پر یقین

انبیاء کی حیثیت چوں کہ لوگوں کو امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دینے والے کی تھی اس لیے ان کی سب سے پہلی اور بنیادی صفت ایمان اور یقین کی ہے۔ جو چیزیں اوروں کے لیے غیب سے تعلق رکھتی ہیں ان میں سے بہت سی چیزیں انبیاء کے لیے شہود کا درجہ رکھتی تھیں۔ اوروں کا ایمان بالغیب، انبیاء کے لیے ایمان بالشہادت تھا۔ بہت سی اشیائے غیب کا اللہ اپنے نبیوں کو دیدار کرادیا کرتا تھا، تاکہ وہ ان کے لیے شہود کی حیثیت اختیار کرلیں اور اپنی امت کو، جن چیزوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں وہ مشاہدے کی وجہ سے ان کے لیے رویت کے درجے میں آجائیں۔

انبیاء، اللہ کے منتخب بندے ہوا کرتے تھے۔ ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ

(الحج:۷۵)

''اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو چھانٹ لیتا ہے۔''

انبیاء کبھی کبھی خود بھی اللہ تعالیٰ سے اس کی قدرت کے اظہار کی درخواست کیا کرتے تھے، جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ درخواست کہ اللہ تعالیٰ مردے کو کیسے زندہ کرتا ہے:

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَئِنَّ قَلۡبِىۡ ؕ (البقرہ:۲۶۰)

''اور (وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے) جب ابراہیمؑ نے کہا تھا، میرے مالک! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ فرمایا، کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔''

اسی عین الیقینی کو متمثل کرنے کے لیے اللہ نے ایک اور نبی کا واقعہ بیان فرمایا ہے، جو ایک برباد شدہ بستی سے گزر رہے تھے۔ ان کے استعجاب پر اللہ نے انھیں سو برس کے لیے مردہ کردیا۔ دوبارہ زندگی حاصل ہونے پر انھوں نے دیکھا کہ ان کا توشہ جوں کا توں موجود ہے لیکن خچر گل سڑ کر بوسیدہ ہو چکا ہے۔ پھر یہ خچر ان کے سامنے ہی زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ (۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زندگی میں اللہ سے ہم کلامی کے کئی مواقع پیش آئے لیکن عین الیقینی کے لیے انھوں نے بھی رویت باری تعالیٰ پر اصرار کیا تھا:

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ○ (الاعراف:۱۴۳)

''جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں! ذرا سامنے پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔ چناں چہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا، پاک ہے تیری ذات۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوامیس فطرت کی رویت کرائی تاکہ انھیں یقین کا درجہ حاصل ہو جائے:

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ○ (الانعام:۷۵)

''ابراہیم کو ہم اسی طرح آسمانوں اور زمین کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لیے (دکھاتے تھے) کہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو جائے۔''

ستاروں، چاند اور سورج کے طلوع و غروب سے معبودان باطل کے انکار پر دلیل دراصل نوامیس فطرت کی رویت کی وجہ سے ہوئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ہدایت شامل حال تھی۔

ایقان الٰہی کے حصول کے لیے رسول اللہ ﷺ کو نبوت عطا ہونے سے پہلے رویائے صادقہ سے مدد پہنچائی گئی۔ (۶) شق صدر کے واقعے کو بھی (۷) ایقان باللہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جس عظیم الشان واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کے قلب کو یقین کے نور سے منور فرمایا گیا وہ واقعہ اسراء (۸) اور معراج (۹) ہے، جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم میں اس طرح ہوا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○ (بنی اسرائیل:۱)

''پاک ہے وہ (اللہ تعالیٰ) جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، (یقیناً اللہ تعالیٰ) ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔''

وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ○ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ○ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ○ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ○ (النجم:۱۳-۱۸)

''اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اسی کے پاس جنۃ الماویٰ ہے، جب کہ سدرہ کو چھائے لیتی تھی وہ چیز، جو اس پر چھا رہی تھی، نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی، یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دیکھ لیں۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں ''اصل بات، جو معراج کے سلسلے میں سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ انبیائے علیہم السلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب کی مناسبت سے ملکوت السمٰوات والارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں، جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے تاکہ ان کا

مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل ممیّز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے۔ وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا۔ مگر انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ بہ راہ راست علم اور مشاہدے کی بنا پر کہتے ہیں۔''(۱۰)

دعوت الٰہی پر یقین کامل رکھنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اپنی دعوت پر ایمان لانے والے پہلے فرد خود انبیاء ہوا کرتے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ

(البقرہ:۲۸۵)

''رسول ایمان لایا اس چیز پر، جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتری اور مومن بھی ایمان لائے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں:

لَا شَرِیْکَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

(الانعام:۱۶۳)

''اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں پہلا ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعلان ہے:

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

(الاعراف:۱۴۳)

''پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا، پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔''

انبیائے کرام کا یہ ایمان و ایقان اس بات پر دلیل ہے کہ دعوت دین کا کام اس

وقت تک انجام نہیں دیا جا سکتا، جب تک داعی کو خود اپنی دعوت پر یقین نہ ہو اور وہ خود اس پر عامل نہ ہو۔

(۲) حسن اخلاق

انبیائے کرام حسن خلق سے مزین ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم:۴)

"اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبہ پر ہو۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ خلق میں قرآن مجسم تھے۔(۱۱) قرآن کریم میں بہت سے انبیاء کا بیان اور ان کے اخلاق حسنہ کا ذکر ہے۔ رسول اکرم ﷺ تمام انبیاء کے خصائل حسنہ کے جامع تھے۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضاء داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

احادیث سے ثابت ہے کہ انبیائے کرام میں آپؐ کی مشابہت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے سب سے زیادہ تھی۔ (۱۲)

چند اہم خصوصیات کا ذکر ہے، جن کا تعلق بہ راہ راست حکمت دعوت سے ہے۔

(۳) صبر و استقامت

اللہ کا حکم ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَﮞ (البقرہ:۱۵۳)

"اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو، بے شک اللہ صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے۔"

نیز فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا قف وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران:۲۰۰)

''اے ایمان والو! صبر سے کام لو، تم ثابت قدم رہو اور ایک دوسرے کو تھامے رکھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

عربی زبان میں صبر کا لفظ عاجزی اور مسکینی کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ عزم اور استقامت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تمام انبیائے کرام صبر و استقامت کا مجسم نمونہ تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اپنی قوم میں تبلیغ کی۔ فرمان خداوندی ہے:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

(العنکبوت:۱۴)

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار سال برس ان کے درمیان رہا۔ آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔''

اس طویل عرصے میں انھوں نے، جس صبر و استقامت کے ساتھ اپنی قوم میں تبلیغ دین کی، اس کی تفصیل سورۂ نوح میں موجود ہے۔ (۱۳) جب اس قوم پر حجت تمام ہوگئی تب آپ نے اللہ سے فریاد کی:

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝
(نوح:۲۶)

''اور نوحؑ نے کہا، اے میرے رب! ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا مت چھوڑ۔''

اسلامی روایات میں صبر ایوبؑ کی مثال دی جاتی ہے۔ یہ ایک صاحب مال و اولاد بزرگ تھے۔ اللہ نے انھیں چیچک کے عارضہ میں مبتلا کر دیا۔ اس مرض میں وہ سات برس اور کچھ مہینہ مبتلا رہے۔ (۱۴) اس عرصے میں ان کے تمام اعزہ اور رفقاء (سوائے بیوی اور دو دوستوں کے) ساتھ چھوڑ گئے۔ مال و اسباب بھی تباہ ہوگیا۔ لیکن ایوب علیہ السلام نے اللہ کے سوا کسی سے فریاد نہیں کی:

وَ اَیُّوۡبَ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ۚۖ ﴿۸۳﴾ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ فَکَشَفۡنَا مَا بِہٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّ اٰتَیۡنٰہُ اَہۡلَہٗ وَ مِثۡلَہُمۡ مَّعَہُمۡ رَحۡمَۃً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَ ذِکۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ ﴿۸۴﴾

(الانبیاء:۸۳،۸۴)

''اور یہی (ہوش مندی اور حکم وعلم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا۔ اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔''

اللہ تعالیٰ نے انھیں صابر بندوں میں شمار فرمایا:

اِنَّا وَجَدۡنٰہُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ (صٓ:۴۴)

''بے شک ہم نے اسے صابر پایا، بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔'' (۱۵)

ایذائیں بہت سے انبیاء کو دی گئیں۔ ان ایذاؤں پر انھوں نے صبر سے کام لیا اور کارِ رسالت سے انحراف کے مرتکب نہیں ہوئے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوۡا ؕ وَ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ وَجِیۡہًا ﴿۶۹﴾ (الاحزاب:۶۹)

''اے ایمان والو! ان لوگوں، جیسے نہ بن جاؤ، جنھوں نے موسیٰ کو تکلیف دی، پس جو بات انھوں نے کہی تھی اللہ نے انھیں اس سے بری فرما دیا، اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا تھا لیکن ان کی قوم نے ہمیشہ ان پر نکتہ چینی کی اور طرح طرح سے ایذائیں دیں۔ یہاں تک

کہ اللہ نے مسلمانوں کو خبردار کر دیا کہ وہ اپنے نبی (محمد ﷺ) کے لیے بنی اسرائیل کی طرح ایذا دہندہ نہ بن جائیں۔

اللہ کی وحدانیت کی طرف لوگوں کو بلانے کا کام ہمیشہ پر از مشقت و اذیت رہا ہے۔ تمام انبیاءؑ کو یہ آزمائش جھیلنی پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۟

(ابراہیم:۱۲)

''اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہ نمائی کی ہے، جو اذیتیں تم ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔''

یوں تو رسول اکرم ﷺ کی پوری زندگی ایذاؤں پر صبر سے بھری پڑی ہے لیکن تکلیف و اذیت کے دو واقعات سرمۂ چشم عبرت ہیں۔ ایک شعب ابی طالب میں تین سال کی محصور زندگی، جس میں حضور ﷺ اور عامۃ المسلمین کو مسلسل فاقوں سے گزرنا پڑا۔ انھوں نے درختوں کے پتے چبائے اور سوکھے چمڑے بھی بھون کر کھائے۔ بچے بھوک سے بلبلاتے رہتے اور قریش مکہ کو رحم نہیں آتا تھا۔ (۱۶) دوسرا واقعہ طائف کا سفر ہے۔ ۱۰ نبوی میں آپ تبلیغ دین کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ وہاں کے سرداروں نے آپ کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا۔ پتھروں کی بارش سے آپ کے پاؤں فگار ہو گئے۔ خون جم جانے سے جوتے آپ کے قدم مبارک سے چپک گئے۔ اس کے باوجود آپؐ نے اللہ سے یہی عرض کی کہ ''اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔'' (۱۷) جب حضرت جبریل علیہ السلام ملک الجبال کے ساتھ تشریف لائے اور کہا کہ اگر حضورؐ حکم دیں تو اہل طائف کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالا جائے تو جواب میں آپ نے یہی فرمایا ''نہیں، بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا، جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھیرائے گی۔'' (۱۸)

حضور ﷺ نے یوم طائف کو اپنی زندگی کا سخت ترین دن قرار دیا تھا۔ اس کے باوجود

سوائے صبر واستقامت کے آپؑ کی ذاتِ مبارک سے کوئی کم زوری صادر نہیں ہوئی۔ داعیان دین حنیف کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ دعوت دین کا کام انتہا درجہ صبر کا متقاضی ہے۔ معلوم رہے کہ عربی ادب اور قرآنی زبان میں صبر اور استقامت ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔

(۴) حلم وعفو

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ o

(آل عمران:۱۳۴)

''وہ (لوگ) جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی ''آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے۔'' (۱۹) اسی لیے آپؑ نے ان کی مغفرت کی دعا بھی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس خیر خواہی کو ''حلم'' سے تعبیر فرماتا ہے:

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیْمٌ o (التوبہ:۱۱۴)

''حق تو یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب بردبار تھا۔''

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ o (ھود:۷۵)

''حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔''

حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی قوم طنزاً کہتی ہے:

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُاط اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُo (ھود:۸۷)

''وہ لوگ کہتے تھے اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے، یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشاء کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو۔ بس تو ہی ایک عالی ظرف اور راست باز رہ گیا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے میں (۲۰) اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اولاد کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں حلیم باپ کو حلیم بیٹے کی بشارت دیتا ہے:

فَبَشَّرْنٰـهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍo (الصّٰفّٰت:۱۰۱)

''(اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔''

عفو کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ جب انھوں نے اپنے بھائیوں کے سامنے خود کو ظاہر کیا تو بھائیوں نے کہا:

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ اِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَo (یوسف:۹۱)

''انھوں نے کہا، بخدا! تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطا کار تھے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے فوراً ارشاد فرمایا:

قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ط یَغْفِرُ اللّٰهُ لَکُمْ ز وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَo (یوسف:۹۲)

''اس نے جواب دیا، آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اللہ تمھیں معاف کرے۔ وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔'' (۲۱)

بالکل یہی بات حضور اکرمؐ نے فتح مکہ کے موقعے پر ارشاد فرمائی تھی:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (۲۲)

"آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔"

اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ (۲۳)

"جاؤ، آج تم آزاد ہو۔"

آپ کے عفو کی ایک بہترین مثال طائف والوں کو معاف کر دینا تھا، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

انبیائے کرام حلم وعفو کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اور یہ صفت ہر داعی کے لیے مطلوب ہے۔

(۵) ایثار وقربانی

ایک انسان دوسرے انسان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اگر اس کے اندر ایثار وقربانی کا جذبہ نہ ہو۔ یہ جذبہ تقرب الٰہی کا خصوصی ذریعہ ہے۔ انبیائے کرام مجسم قربانی وایثار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً
مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ
وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر:۹)

"یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں، جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اللہ کی راہ میں بہترین چیز خرچ کرتے ہیں تاکہ اس کی خوش نودی حاصل کریں:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (آل عمران:۹۲)

”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (راہ خدا میں) خرچ نہ کرو، جنھیں تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔“

صحابہ کرام کے ایثار کا کچھ اندازہ جیش عسرت یا غزوۂ تبوک میں ان کی اعانتوں سے ہوتا ہے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس موقعے پر ایک ہزار دینار خرچ کیے۔ (۲۴) قاضی سلیمان منصور پوری نے ایک ہزار دینار کے علاوہ نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے بھی لکھا ہے۔ (۲۵) مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے اس پر دو سو اوقیہ (تقریباً ساڑھے انیس کلو) چاندی کا اضافہ فرمایا ہے۔ (۲۶) سیرت نبوی ﷺ کی مختلف کتابوں کے مطابق صحابہ کرام کے ذوق انفاق کا اندازہ درج ذیل تفصیل سے ہوگا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مجھز جیش العسرۃ (فاقہ زدہ لشکر کو سامان مہیا کرنے والا) کا خطاب۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ: دو سو اوقیہ (تقریباً ساڑھے انتیس کلو) چاندی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: پورا اثاث البیت (مقدار چار ہزار درہم) یعنی گھر کا پورا سامان۔ حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ: نوے وسق (ساڑھے تیرہ ہزار کلو یا ۱۳٫۵ ٹن) کھجور۔ حضرات طلحہ، سعد بن عبادہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم: مال کی کافی مقدار۔

دیگر صحابہ کرام نے حسب توفیق اور خواتین نے ہار، باز و بند، پازیب، بالی اور انگوٹھی وغیرہ۔ (۲۷)

یہ صدقات حسن نیت سے کیے گئے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے سب کی یکساں تحسین کی اور بشارت دی:

مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ. (۲۸)

”جس نے جیش عسرت کی تیاری میں مدد کی اللہ نے اس کی مغفرت فرمادی۔“

اللہ کا دین قربانی طلب کرتا ہے۔ قربانی کے اس خدائی معیار کا حق دار، اس کے دو حلیم بندوں کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ o وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ o

(الصّٰفّٰت: ۱۰۶،۱۰۷)

''یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب میں اشارہ پا کر اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دیتے ہیں، وہ بیٹا جو فرمان بردار، سعادت مند اور احکام الٰہی کا پابند ہے۔ (۲۹) مبارک ہے وہ قربانی، جو اللہ کو اس قدر پسند آئے کہ وہ اس کو قیامت تک کے لیے نمونہ بنا دے:

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ o ((الصّٰفّٰت: ۱۰۸)

''اور ہم نے (اس سنت) کو بعد میں آنے والوں کے لیے جاری کر دیا۔''

اور قیامت تک کے لیے لکھ دیا:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ o (الکوثر: ۲)

''پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔'' (۳۰)

اللہ کا دین آج بھی جان اور مال کی قربانی کا طالب ہے۔ کیا داعیان دین حق اس قربانی کے لیے تیار ہیں؟

(۶) عدل وقسط

عدل کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا عقیدۂ آخرت اسی عدل کے نفاذ کے لیے ہے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس صفت کو منصب خلافت سے جوڑ دیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط

(ص: ۲۶)

''اے داوٗد! ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنا دیا تا کہ تم لوگوں کے درمیان حق کے

ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔"

اللہ نے عدل کا حکم انفرادی زندگی میں بھی دیا ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی۔ فرمان الٰہی ہے:

وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰیۚ (الانعام:۱۵۲)

"اور جب تم بات کرو تو انصاف کرو گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو۔"

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝

(المائدہ:۸)

"اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔ کسی قوم کی عداوت تمھیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کر دے۔ عدل کیا کرو، جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے باخبر ہے۔"

یہ دونوں آیتیں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل قائم کرنے کا حکم دیتی ہیں۔

سورہ صٓ کی آیت ۲۶ دراصل اس سے ماقبل کی آیات ۲۲ تا ۲۴ کے جواب میں ہے، جس میں ننانوے دنبیوں اور ایک دنبی والے کا قضیہ پیش کیا گیا ہے۔ قرآن یا صحیح احادیث و آثار میں اس کی کوئی تفصیل نہیں آئی۔ لیکن یہی قصہ بائبل میں مذکور ہے، جو نا قابل نقل ہے۔ (۳۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی توثیق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے:

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ۝ۙۗ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؗ (الانبیاء:۷۸،۷۹)

"اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو یاد کیجیے جب کہ وہ کھیت کے معاملے میں فیصلہ

کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو اس میں چر چگ گئی تھیں اور ان کے فیصلے میں ہم موجود تھے۔ ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا۔ ہاں! ان میں سے ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا تھا۔" (۳۲)

احادیث میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک اور فیصلے کا ذکر آتا ہے، جس کا تعلق حکمت نبوی سے ہے اور جس میں اصل ماں نے اپنے بچے سے اس لیے دست برداری اختیار کی تھی کہ اس کے دو ٹکڑے نہ کیے جائیں۔ اس طرح حضرت سلیمانؑ کو انصاف کرنے میں مدد ملی۔ (۳۳)

آں حضرت ﷺ کے عدل کی مثالیں نبوت سے قبل بھی ملتی ہیں۔ خانۂ کعبہ کی تعمیر نو کے وقت جب قبائل قریش میں حجر اسود کی تنصیب کے لیے خانہ جنگی کا اندیشہ پیدا ہو گیا تو آپ نے اپنی چادر مبارک پر خود حجر اسود رکھ دیا اور فضیلت کے دعویداروں نے چادر کے ایک ایک گوشے کو پکڑ کر اس کے مقام پر پہنچا دیا۔ پھر آپ نے اپنے دست مبارک سے اسے اس مقام پر نصب کر دیا جہاں یہ آج بھی نصب ہے۔ اس معاملے میں آپ کی دور اندیشی کے علاوہ انصاف اور عدل کا عنصر بھی شامل تھا۔ (۳۴)

عدل کی ایک ذیلی تقسیم صحیح پیمانے سے ناپ تول کرنا بھی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی پوری قوم اس مرض میں مبتلا تھی، اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اسی کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا:

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۟

(الاعراف:۸۵)

"اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم مومن ہو۔" (۳۵)

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ویل (تباہی) کی وعید ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۙ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ○ وَ
إِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۙ○ (المطففین:۱-۳)

''تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انھیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔''

سماج کو ظلم اور فساد سے بچانے کے لیے اور تباہی سے محفوظ رکھنے کے لیے ناپ تول میں عدل کو ملحوظ رکھنا آدمی کا شعار ہونا چاہیے۔

(۷) صدقِ وامانت

صدق وامانت وہ اعلیٰ صفات ہیں، جن کی وجہ سے آدمی دوسروں سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتا ہے اور جس کی بنا پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ذمے داریوں کا بوجھ اس پر ڈالا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ بعثت سے پہلے ہی عرب میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔(۳۶) صدق بہت سے انبیائے علیہم السلام کی صفت رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ ۬ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ○

(مریم:۴۱)

''اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو۔ بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔''

ادریس علیہ السلام (۳۷) کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِدْرِيسَ ۬ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۙ○ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ○ (مریم:۵۷)

''اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو۔ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا۔''

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ (مریم:۵۴)

''اور اس کتاب میں اسمٰعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ان کے ایک رفیق زنداں کا خطاب ہے:

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا (یوسف:۴۶)

''یوسف، اے سراپا راستی! ہم کو بتا...''

امِ عیسیٰ حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ (المائدہ:۷۵)

''مسیح ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا۔ اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔ اس کی ماں ایک راست باز عورت تھی۔''

حضرت مریم علیہا السلام کی صداقت کو اللہ تعالیٰ نے بہ طور نمونہ پیش فرمایا ہے۔

امانت کی صفت قدرے وضاحت طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا: (۳۸)

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ (البقرہ:۳۰)

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا، میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

یہ دراصل اس کی تکریم و فضیلت تھی، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۚ

(بنی اسرائیل:۷۰)

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔''

اس کے پہلے اللہ تعالیٰ اپنی دوسری مخلوقات کو اس امانت کی پیش کش کر چکا تھا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (الاحزاب:۷۲)

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''

معلوم ہوا کہ امانت سے مراد دراصل خلافتِ ارضی ہے، جو اللہ نے انسان کو اس لیے عطا فرمائی کہ وہ بہ حیثیت ایک ذمے دار کے اللہ کی مرضیات کو زمین پر نافذ کرے۔ ان معنوں میں انبیائے کرام اس امانت کے اولین امین ہیں۔

امانت مومن کی وہ صفت ہے، جو اس کی ذات کا جزو لاینفک ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ (المومنون:۸)

''(مومن وہ ہیں) جو اپنی امانتوں اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

لیکن یہ صرف ایک صفت محمود ہی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم واجب الاطاعت بھی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ (النساء:۵۸)

''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو۔''

ہجرت کی رات بستر رسول پر محو استراحت ہو کر حضرت علیؓ بھی آں حضور ﷺ کی صفتِ امانت میں شریک ہو گئے۔ (۳۹)

(۸) ایفائے عہد

اللہ کا حکم ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ (المائدہ:۱)

''اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَ اَوْفُوْا بِالْعَھْدِ ۚ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا ٥ (بنی اسرائیل:۳۴)

''عہد کی پابندی کرو۔ بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے مشرک باپ کی مغفرت کی دعا ان کے سابق میں کیے گئے وعدے ہی کی رہین منت تھی۔

صحابی رسول حضرت عبداللہ بن ابی الحمساءؓ بیان کرتے ہیں کہ ''بعثت سے پہلے میں نے آں حضرت (ﷺ) سے کسی معاملے میں بات کی۔ ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ مجھے کسی ضرورت سے دوسری طرف جانا پڑا۔ جاتے ہوئے میں نے آپ سے کہا کہ، آپ یہیں ٹھیرے رہیں، میں واپس آکر معاملہ ختم کرتا ہوں۔ وہاں سے جانے کے بعد مجھے اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ جب تیسرے دن میرا ادھر سے گزر ہوا تو دیکھا کہ آپ وہیں میرے منتظر کھڑے ہیں۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر صرف اس قدر کہا کہ تم نے مجھ کو تکلیف و مشقت میں ڈال دیا۔ (۴۰) یہ واقعہ بعثت نبوی سے پہلے کا ہے۔

(۹) رفق و محبت

ماں باپ اور بیوی بچوں سے سبھی محبت کرتے ہیں، انبیاء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یہ محبت ہی تھی، جس کی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا تھا:

سَلٰمٌ عَلَیْکَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا ٥

(مریم:۴۷)

''سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کردے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔''

نوح علیہ السلام نے بھی کہا تھا:

رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَکَ الۡحَقُّ (ہود:۴۵)

''اے رب! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ برحق ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِکَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ۫ۖ (ہود:۴۶)

''وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا عمل ہے۔''

لیکن جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تو اللہ خود گواہی دے رہا ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ ۪ (آل عمران:۱۵۹)

''یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔''

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ بھی آپ کی طرف رہا کرتی تھی اور وقتاً فوقتاً اس کی طرف سے ہدایات بھی آتی رہتی تھیں۔ چناں چہ ارشاد باری ہے:

وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَیۡکَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِکَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَکُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ۝

(الانعام:۵۲)

''اور جو لوگ رات دن اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوش نودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انھیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے، اور تمھارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ اس پر بھی اگر تم انھیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہوگے۔''

اس مسئلے میں تو اللہ کی نگاہ توجہ ایسی تھی کہ عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپؐ کو تنبیہ کی گئی:

عَبَسَ وَ تَوَلّٰیٓ ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰیٓ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ؕ (عبس:۱-۴)

''ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو۔''

قبول حق کے لیے آمادہ سعید ارواح کو اپنے سے دور نہ چھٹکنے کی نصیحت دیگر انبیاءؑ کو بھی کی گئی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جب ان سے کہا:

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ (ہود:۲۷)

''ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے، جو ہمارے یہاں اراذل تھے بے سوچے سمجھے تمھاری پیروی اختیار کر لی ہے۔''

اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَآ اَنَاْ بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ (ہود:۲۹)

''اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا، جنھوں نے میری بات مانی ہے۔ وہ اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔''

ایک دوسری جگہ پھر انھوں نے یہی بات کہی ہے:

وَمَآ اَنَاْ بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ۚ (الشعراء:۱۱۴)

''میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو ایمان لائیں ان کو میں دھتکار دوں۔''

(۱۰) دل سوزی و دل نوازی

رفق و محبت کی صفت کا اظہار خارج میں ہوتا ہے، لیکن دل گیری اور دل ریشی انبیائے کرام کی وہ صفت ہے، جس کا رشتہ بہ راہ راست اللہ کی صفت ودودیت اور رحمانیت و رحیمیت سے ہے۔ الرحمٰن اور الرحیم کی دو صفات وہ ہیں، جن سے بے پایاں اور مسلسل جاری رحم کا اظہار ہوتا ہے اور جسے اللہ نے قرآن کی ابتدا ہی میں دو بار اپنی طرف منسوب کیا ہے، ایک بسملہ میں اور دوسرے سورۃ الفاتحہ کی دوسری آیت میں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''نہایت مہربان'' اور ''نہایت رحم فرمانے والا۔'' (۴۱) نیز اپنے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے:

وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُۙ (البروج:۱۴)

''وہ بخشنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے۔''

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت فرماتا ہے، جتنی چڑیا اپنے بچوں سے محبت کرتی ہے (۴۲) یا ماں اپنے بچوں سے کرتی ہے۔ (۴۳) انبیاء کی خیر خواہی کی مثال رسول اللہ ﷺ نے یوں دی ہے، جیسے ''میری اور تم لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے، جس نے آگ جلائی روشنی کے لیے، مگر پروانے ہیں کہ اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں جل جانے کے لیے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح آگ سے بچیں، مگر پروانے اس کی چلنے نہیں دیتے۔ ایسا ہی حال میرا ہے کہ میں تمھیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑتے ہو۔'' (۴۴) کتنی تڑپ ہے آپ کی اس خواہش میں کہ لوگ اس آگ سے بچ جائیں۔ اس فکر میں آپ اپنی جان گھلائے دے رہے ہیں، یہاں تک کہ اللہ آپ کو تسلی کے کلمات سے نوازتا ہے:

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ (فاطر:۸)

''(اے نبیؐ) خواہ مخواہ تمھاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۝ (الکہف:۶)

''اچھا تو کیا اے نبیؐ! شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو، اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لے آئے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہدایت وضلالت کے بارے میں اللہ کا ایک متعین قانون ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کی خواہش کا کوئی دخل نہیں:

اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ

(القصص:۵۶)

''اے نبیؐ! تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

یہی دل سوزی اور دل نوازی اس وقت جھلکتی ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو ''اے میرے باپ، اے میرے پیارے باپ!'' (یٰٓاَبَتِ یٰٓاَبَتِ) کہہ کر خطاب کرتے ہیں اور وہ انھیں رجم کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ (۴۵)

واقعہ یہ ہے کہ دعوت دین کے معاملے میں جب تک داعی کے دل میں محبت کی تڑپ نہ ہو مدعو پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۱۱) جرأت وشہامت

جرأت اور شجاعت کو علمائے لغت نے صبر ہی کے خصائص میں شمار کیا ہے۔ امام راغب اصفہانی نے ''مفردات القرآن'' میں لکھا ہے کہ جنگ میں ''صبر'' کا لفظ شجاعت کے معنی دیتا ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے بھی ''لغات القرآن'' میں اسی کو نقل کر دیا ہے۔ لیکن چوں کہ اردو زبان میں جرأت، شجاعت اور بہادری کا ایک خاص تصور ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس نقطۂ نظر سے مطلوبہ صفت جرأت وشہامت کا جائزہ لیا جائے۔

منکرین کے سامنے دعوت حق کا پیش کرنا نہایت دلیری کا کام ہے کیوں کہ اس میں جان کے زیاں کا بھی اندیشہ ہوا کرتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے دعوت پیش کرنے میں اندیشے کا اظہار کیا:

وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۚ (الشعرا:۱۴)

''اور ان کا مجھ پر میرے ایک قصور کا (دعویٰ) بھی ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے مار نہ ڈالیں۔''

تو ارشاد ہوا:

کَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ (الشعراء:۱۵)

''ہرگز ایسا نہ ہوگا، تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ۔ ہم خود سننے والے تمھارے ساتھ ہیں۔''

اور حضرت محمد ﷺ کے لیے تو صاف صاف ارشاد ہوا:

وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ (المائدہ:۶۷)

''اللہ تم کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔''

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرات موسیٰ وہارون علیہما السلام نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ کہیں فرعون ان کے اوپر زیادتی نہ کرے یا حد سے نہ بڑھ جائے تو اللہ نے اس موقعے پر فرمایا:

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی ۝ (طٰہٰ:۴۵،۴۶)

''دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں خوف ہے کہ کہیں فرعون ہم پر کوئی زیادتی نہ کرے یا اپنی سرکشی میں بڑھ نہ جائے۔ جواب ملا کہ تم مطلقاً خوف نہ کرو، میں تمھارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہوں گا۔''

یہ اللہ کی طرف سے دو جلیل القدر انبیاء کے تحفظ کا وعدہ ہے۔

لیکن نبی کے ساتھیوں میں دلیری اور شجاعت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ داعی، مدعوئین کی نگاہوں کے سامنے بھی نڈر نہ ہو، کیوں کہ رسول ہر معاملے میں امت کے لیے نمونہ ہوا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے کہ ''جب گھمسان کا رن پڑتا اور لڑنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا اس وقت ہم نبی ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے، اور ہم میں سے سب سے آگے دشمن کی جانب نبی کریمؐ ہی ہوتے تھے۔'' صحیحین میں ہے کہ ایک رات مدینہ میں غل پڑا کہ دشمن آگئے۔ لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل پڑے اور دفاع کے لیے مدینہ سے باہر جانے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہتھیار لگائے باہر سے واپس تشریف لا رہے ہیں اور تسلی دے رہے ہیں کہ لوگ گھروں کو واپس جائیں

گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مسلم میں ہے کہ نزل النبی عن بغلتہ (یعنی نبی ﷺ اپنے خچر سے اتر پڑے)۔ بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی تو آپ تن تنہا میدان جنگ میں ڈٹے رہے اور اپنے لشکر کو پکارتے رہے۔ اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ رجز یہ شعر تھا

أَنَا النَّبِيُّ لاَ كَذِب أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب

(یعنی میں نبی ہوں، جھوٹا نہیں۔ میں ابن عبدالمطلب ہوں)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ یعنی ''رعب سے میری مدد کی گئی۔'' یہ آپ ہی کی دلیری اور شجاعت تھی، جس کا عکس آپ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا میں آیا جب انھوں نے غزوۂ احزاب کے موقعے پر فارع نامی قلعہ کے باہر خیمہ کی چوب سے ایک یہودی کا سر پاش پاش کر دیا۔ غزوۂ احد کے موقعے پر جب مومنوں کے اوپر آزمائش کا وقت آن پڑا تھا اس وقت حضرت صفیہؓ کے علاوہ حضرت عمارہ بنت زیادؓ نے رسول اللہ ﷺ کی جی جان سے حفاظت کی۔ غزوۂ احد کے جاں نثاروں میں حضرات ابودجانہؓ، حنظلہؓ، علی مرتضیٰؓ اور طلحہؓ کے ناقابل فراموش نام بھی ہیں۔ بئر معونہ کے شہداء میں حضرت زیدؓ اور حضرت خبیبؓ نے اپنے خون کی سرخی سے شہادت حق کی داستان رقم کی ہے۔ اولین شہدائے اسلام میں آل یاسرؓ کا نام اگر صابرین میں شمار ہوا ہے تو قیصر روم کے ہاتھوں شام کے گورنر فردہ بن عمرو خزاعی کی اسلام کے لیے جاں سپاری ان کی شجاعت اور شہامت میں شمار کی جائے گی۔ معلوم رہے کہ انھوں نے اسلام چھوڑ دینے کے لیے قیصر روم کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی پاداش میں شہادت قبول کر لی تھی۔

اسلامی تاریخ بھی جرأت کی ان مثالوں سے خالی نہیں ہے۔ حضرات امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام ابن تیمیہؒ اور دوسرے اساطین امت شہادت حق کی پاداش میں معتوب حکومت رہے ہیں۔ ایک مرد قلندر کی اذان نے پوری تاتاری قوم کو اسلام کی لذت سے آشنا کر دیا۔ مصر میں اخوانیوں کی خونی قبائیں، بانی جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی سزائے موت (جو بعد میں منسوخ کر دی گئی)، پوری دنیا میں استخلاص اور استقلال

اسلام کے لیے مجاہدین کا بہتا ہوا خون اس بات کا شاہد ہے کہ اسلام جس صبر کی تلقین کرتا ہے وہ صرف برداشت نہیں ہے بلکہ عزیمت واستقامت اور جرأت وشہامت بھی ہے۔

(۱۲) شیریں کلامی اور طلاقت لسانی

فصاحت وبلاغت عطیۂ خداوندی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنھیں اس نعمت کا وافر حصہ ملا ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی:

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۙ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۠ (طٰہٰ: ۲۷، ۲۸)

"اور میری زبان کی گرہ (بھی) کھول دے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس جانے میں جو تکلف محسوس کر رہے تھے اس کا ایک سبب زبان کی ناہمواری بھی تھی، اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ چناں چہ انھوں نے اللہ کے حضور یہ درخواست بھی کی تھی:

وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ۝

(الشعراء: ۱۳)

"اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔ میری زبان چل نہیں رہی ہے۔ پس تو ہارون کی طرف (بھی) رسالت بھیج۔"

گفتگو کی ترسیل کے لیے ضروری ہے کہ سامع زور خطابت سے مسحور ہو جائے۔ بغیر اس کے مخاطب کے اوپر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

قرآن اپنے اعجاز میں لوگوں کے لیے ایک چیلنج تو تھا ہی، جس کی وجہ سے لبید جیسے معلقات کے شاعر اور خنساء جیسی قادر الکلام شاعرہ نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو خود افصح العرب والعجم کہا جاتا ہے۔ آپ جامع الکلم تھے۔ یہ آپؐ ہی کا قول ہے:

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً وَ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا۔ (۴۶)

"بعض شعر میں حکمت ہوتی ہے اور بعض بیان جادو ہوا کرتا ہے۔"

لوگ رسول اللہ ﷺ کی حرکات لب کے منتظر رہا کرتے تھے۔ آپؐ کے کتنے ہی اقوال

ضرب المثل بن چکے ہیں۔آپ کی طلاقت لسانی کے بارے میں سیرت نگاروں نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور اس کے لیے ابواب قائم کیے ہیں۔ہم یہاں ''الرحیق المختوم'' سے ایک مختصر سی عبارت نقل کر رہے ہیں،جس سے آپ کے حسن کلام پر کچھ روشنی پڑے گی۔

''نبی کریمؐ فصاحت و بلاغت میں ممتاز تھے۔آپ طبیعت کی روانی،لفظ کے نکھار،فقروں کی جزالت،معانی کی صحت اور تکلف کی دوری کے ساتھ ساتھ جوامع الکلم (جامع باتوں) سے نوازے گئے تھے۔آپؐ کو نادر حکمتوں اور عرب کی تمام زبانوں کا علم عطا ہوا تھا۔چناں چہ آپؐ ہر قبیلہ سے اسی کی زبان اور محاوروں میں گفتگو فرماتے تھے۔آپؐ میں بدویوں کا زور بیان اور قوت تخاطب،اور شہریوں کی شستگیِ الفاظ اور شگفتگی و شائستگی جمع تھی۔اور وحی پر مبنی تائید ربانی الگ ہے۔''
(۴۶ الف)

آپؐ کے اصحابؓ میں بھی آپؐ کی ان صفات حسنہ کا پرتو تھا اور آپؐ ان کی تربیت بھی فرماتے رہتے تھے۔لکھنے اور پڑھنے کی رغبت دلانے کے علاوہ آپؐ لوگوں کو عبرانی اور رومی زبان بھی سیکھنے کا شوق دلاتے تھے،تاکہ یہودی اپنی کتاب کے بارے میں مسلمانوں کو کوئی دھوکہ نہ دے سکیں اور رومی سرداروں اور امرا سے مراسلت کرنے میں سہولت ہو۔آپؐ شاعر نہیں تھے لیکن اچھے کلام کی آپؐ کو خوب پرکھ تھی۔حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے آپؐ مسجد نبوی میں ممبر رکھواتے تھے،اس سے آپؐ کے ذوق سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔

اچھا کلام خواہ نثر ہو یا نظم اور خواہ وہ تحریر ہو یا تقریر،انسان کی روح کو شاد کام کرتا ہے۔مسلمانوں میں اچھے مقررین اور اچھے مصنفین نے اپنی اپنی تاریخ بنائی ہے۔ہمارے پاس اسلاف کی علمی تصنیفات کا،جو ذخیرہ ہے وہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ماضی قریب میں سید جمال الدین افغانی،مفتی محمد عبدہ،سید رشید رضا،علامہ سعید نورسی،علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،علامہ محمد اسد،مولانا ابوالکلام آزاد،شیخ حسن البنا،مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی،مولانا ابوالحسن علی ندوی،سید قطب،مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا صدر الدین اصلاحی رحمہم اللہ وغیرہ کی تحریریں ہمارے لیے بار بار پڑھنے کا مواد مہیا کرتی ہیں۔دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے حسن بیان اور نظم کلام کا اختیار کرنا ناگزیر ہے کیوں کہ بغیر اس کے دین کی دعوت میں کوئی اثر نہیں پیدا ہو سکتا۔

(۱۳) کمال شخصیت اور فطری صلاحیت

آدمی کی ذات اس کی شخصیت کا آئینہ ہوا کرتی ہے۔اس ذات کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔داعی کا ظاہر اور باطن دونوں صاف اور شفاف ہونے چاہئیں۔ظاہر کا مطلب یہ ہے کہ جسم اور لباس صاف ستھرے ہوں۔ پوشش اور لباس کے معاملے میں اگر چہ کوئی خاص ہدایت نہیں ہے لیکن اجنبیوں کے تشبہ سے احتراز لازم ہے۔سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے نہ ہوں کہ دیکھ کر لوگوں کو وحشت ہو۔جسمانی صحت پر بھی داعی کو توجہ دینی چاہیے۔جہاں تک ممکن ہو آدمی کو روغن اور خوش بو کا استعمال کرنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے مسجدوں میں زینت کے ساتھ آنے کا حکم دیا ہے:

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

(الاعراف:۳۱)

''اے بنی آدم!تم مسجد میں ہر حاضری کے وقت زینت کے ساتھ آؤ۔''

رسول اللہ ﷺ نہایت خوب صورت،تندرست،سلیقہ شعار،حسب استطاعت خوش پوش، متبسم لیکن نہایت بارعب اور بلند و بالا قد کے مالک تھے۔جہاں تک آپؐ کی سیرت کا تعلق ہے، اس موضوع پر مختلف زبانوں میں تصنیفات کے انبار ہیں۔محدثین نے آپؐ کے شمائل پر بھی احادیث کے مجامع تیار کیے ہیں۔غرض کہ آپؐ کی شخصیت ظاہر میں جمال خلق اور باطن میں کمال خلق کا مجموعہ تھی۔دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے اس میں ایک سبق ہے۔دین کا کام کرنے والوں کے لیے کام کے الگ الگ میدان ہیں، جو شخص جس میدان میں کام کر رہا ہو اسے اپنے کو اسی کے مطابق تیار کرنا چاہیے۔رسول اللہ ﷺ نے اجتہاد کی صلاحیت کی بنا پر حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا عامل اور قضاء کی صلاحیت کی بنا پر حضرت علی مرتضیٰؓ کو وہاں کا قاضی مقرر فرمایا تھا۔اپنی خصوصیت کی بنا پر ابوعبیدہ بن جراحؓ 'امین الامۃ' حضرت خالد بن ولیدؓ 'سیف اللّٰہ' اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ 'صدیق' قرار پائے۔حق ہی کی بنا پر غزوۂ احد میں حضرت ابو دجانہؓ کو تلوار عطا ہوئی اور خیبر میں حضرت علیؓ لواء کے مستحق قرار دیے گئے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی بصیرت اور مردم شناسی تھی کہ آپؐ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو تنہائی کی راہ

کا مسافر قرار دیا۔ ماضی قریب میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، نواب بہادر یار جنگؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور سید حامد حسینؒ اقلیم خطابت کے بادشاہ تھے۔ قلم کی دنیا میں مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا عثمان فارقلیطؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا منظور احمد نعمانیؒ اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا سکہ چلتا تھا۔ مناظرے کی رزم گاہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ اور شیخ احمد دیداتؒ کے مقابل کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ آج کے ماحول میں شخصیت (Personality) بنانا بھی ایک فن اختیار کر چکا ہے، جس کا تعلق فرد کی مخصوص صلاحیت اور اس کے طبعی رجحان (Aptitude) سے ہے۔

باب دوم

دعوت دین کا طریقۂ کار

انفرادی طریقۂ کار

ابھی تک داعی کی ذاتی صفات پر گفتگو تھی۔ اب داعی کے طریق کار پر گفتگو ہوگی۔ اس کی بھی دو حیثیتیں ہیں (۱) انفرادی (۲) اجتماعی۔ اس باب میں ہم انفرادی طریق کار پر گفتگو کریں گے۔ اس میں بھی کئی نکات ہیں۔

(۱) حکمت و موعظت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

(النحل: ۱۲۵)

''اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجیے۔''

حکمت اور نصیحت کی تشریح مولانا مودودیؒ نے یوں فرمائی ہے: ''حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے۔ پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے، جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے

پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ برائیوں اور گم راہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں ان ـ کے لیے، جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج سے آگاہ کیا جائے۔ ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے، جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔" (۴۷)

حکمت و موعظت کی بہترین مثال اس آیت میں ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ٥

(آل عمران:۶۴)

"(اے نبیؐ کہو)، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف، جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔"

حکمت و موعظت کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ نبوت حاصل ہونے کے بعد موقع ملتے ہی آپ اصحاب زنداں پر تبلیغ کا کام شروع کر دیتے ہیں:

يٰصَاحِبَىِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ٥ (یوسف:۳۹)

"اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق کئی ایک پروردگار بہتر ہیں یا ایک اللہ زبردست، طاقت ور۔"

(۲) جدال احسن

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (النحل:۱۲۵)

"اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے سے، جو بہترین ہو۔"

جدال احسن کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں: "یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجانا نہ ہو، بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجے کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی نہ پیدا ہونے دی جائے۔ سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ گم راہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔" (۴۸)

ناچیز کے خیال میں جدال احسن کی تعریف میں منجملہ اور طریقوں کے مباحثہ یا مناظرہ اور آخری چارۂ کار کے طور پر مباہلہ بھی شامل ہیں۔ مباہلہ رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا ہے، جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے:

فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ قف ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ O (آل عمران:۶۱)

"(یہ علم آجانے کے بعد) اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اے نبیؐ اس سے کہو کہ آؤ، ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔"

بیسویں صدی کی ابتدا میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے متنبّی وقت مرزا غلام احمد قادیانی سے مباہلہ کیا تھا۔

سورۂ آل عمران آیت ۶۴ کا خطاب یہودیوں اور نصرانیوں دونوں سے ہے جب کہ

آیت ۶۱ کے مخاطب نجران کے عیسائی ہیں۔اس کی تشریح میں مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

"فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفد نجران جان بوجھ کرہٹ دھرمی کررہا ہے۔اوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا جواب ان لوگوں کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ میں ایسی سند نہ پاتے تھے، جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امر واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہر گز نہیں ہے۔ پھر نبی ﷺ کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد بھی اپنے دلوں میں آپؐ کی نبوت کے قائل بھی ہوگئے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمھیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلے میں دعا کرو کہ، جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلے کے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری، جن کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔" (۴۹)

حکمت اور موعظت کے ساتھ دعوت دین پیش کرنے کی ہدایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان الفاظ میں دی گئی ہے:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ: ۴۳،۴۴)

"جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس، وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور ڈر جائے۔"

جدال احسن کے انبیائی طریق کار میں ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اسوہ سے اچھی رہ نمائی ملتی ہے، جو سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوئی ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَ

اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیۡ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۚ (البقرہ:۲۵۸)

''تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا اس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے، اور اس بنا پر کہ اللہ نے اس شخص کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے، جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا، زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا، اچھا! اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا، یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا۔ مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔''

دعوت حق کے بہت سے مراحل میں ناکامی کے اسباب میں سے ایک سبب داعی کے اندر اس صفت کا مفقود ہونا ہے، اس لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی یہ کمی بہ ہر صورت دور کرے۔

(۳) تدریج وترتیب

نبوت کی ابتدا میں بندگان خدا دعوت دین سے بالکل نا آشنا ہوتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں حکمت تدریج کو ملحوظ رکھا ہے۔ مبارک ہیں وہ اول الاسلام، جو آیت: وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۙ (الشعراء:۲۱۴) ''اپنے قریب ترین رشتے داروں کو ڈراؤ۔'' کے نزول سے قبل ہی ایمان لے آئے تھے۔ ابن ہشام نے ظہور اسلام سے قبل حضرت سلمان فارسیؓ (۵۰) کے علاوہ چار دیگر اشخاص کا ذکر کیا ہے، جو مذہب توحید پر کاربند تھے: (۱) ورقہ بن نوفل (۲) عبید اللہ بن جحش (۳) عثمان بن حویرث اور (۴) زید بن عمرو۔ ان میں سے صرف عبید اللہ بن جحش کو ایمان لانے کا موقع حاصل ہوا لیکن یہ بدتوفیق ہجرت حبشہ کے دوران نصرانی ہوگیا۔ اس ارتداد کی وجہ سے حضرت ام حبیبہؓ سے اس کا نکاح ٹوٹ گیا لیکن آں حضرتؐ کے فیض توجہ سے وہ حریم نبوت میں داخل ہوگئیں۔ (۵۱) آیت مذکورہ کے نزول سے قبل، جو لوگ ایمان لے آئے، ان میں اولیت زوجہ رسول ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، جو حضور اکرم ﷺ کے زیر کفالت (اور زیر تربیت) تھے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا شمار بھی خادم رسولؐ ہونے کی وجہ سے اہل خانہ میں تھا، اس لیے یہ بھی اول ہی دن ایمان لے آئے۔

اہل خانہ سے باہر آپ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اسی دن مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان لوگوں کے ایمان میں علمائے اسلام نے کسی کو ترجیح زمانی نہیں دی، البتہ ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا ایمان مواقع کے حصول کا رہین منت تھا۔ (۵۲)

کسی کام کو آگے بڑھانے کی فطری تدریج یہی ہے کہ ابتدا اپنی ذات سے ہو، پھر اہل خانہ اور قریب ترین اس سے فیض یاب ہوں۔ اس کے بعد بہ تدریج خاندان کے دوسرے لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے۔ مذکورہ وحی ''اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ'' کی تعمیل میں آں حضور ﷺ نے دو مرتبہ اپنے اہل خاندان کو دعوت طعام پر مدعو کیا۔ (۵۳) پھر جب آیت: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الحجر: ۹۴) ''جس چیز کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی پروا مت کرو۔'' نازل ہوئی تو آپ نے تبلیغ عام کی ابتدا کر دی۔ اس مقصد کے لیے آپ نے طائف کا سفر بھی فرمایا۔ زمانۂ حج میں حجاج سے ملاقاتیں کیں اور وفود مدینہ پر خصوصی توجہ فرمائی۔ آپ نے مدینہ پہنچتے ہی پورے جزیرۃ العرب میں وفود بھیجنے کا آغاز کر دیا۔ عرب سے باہر شاہان روم، فارس، مصر، حبشہ اور دیگر باج گزاران عرب کو خطوط بھیجے۔ (۵۴) یہاں تک کہ آپ کی وفات تک پورا عرب مسلمان ہو گیا۔ واضح رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مصر و عرب کا سفر بھی اسی مقصد کے حصول کی خاطر تھا۔ (اس پر تفصیلی گفتگو ہجرت کے عنوان کے تحت آگے آ رہی ہے)

قرآن کریم میں سورۂ مریم میں حضرت ابراہیمؑ کے اپنے والد کو دعوت دینے کا ذکر آیا ہے۔ (۵۵) سورۂ تحریم میں حضرات نوح و لوط علیہما السلام کی بیویوں کا ذکر ہوا ہے، جنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ (۵۶) اسی سورہ میں فرعون کی بیوی اور ام عیسیٰ حضرت مریمؑ کا ذکر آیا ہے، جنھوں نے اسلام کی راہ میں تکلیفیں اٹھائیں اور بدنامی برداشت کی۔ (۵۷) سورۂ ہود میں نوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذکر ہوا ہے، جو بالآخر طوفان باد و باراں میں غرق ہو گیا۔ (۵۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصل ذمے داری بنی اسرائیل کو مصر کی غلامی سے نجات دلا کر فلسطین میں آباد کرنا تھا تاکہ وہاں دین کو قائم کیا جائے لیکن کار نبوت کی بجا آوری کے لیے فرعون کو دعوتِ توحید دینے پر بھی آپ کو مامور کیا گیا تھا۔ (۵۹)

تدریج و ترتیب دعوت ہر ملک اور ہر زمانہ میں مطلوب و مقصود رہی ہے۔ دعوت دین کا کام کرنے والوں کے لیے اسوہ رسولؐ میں ایک سبق ہے۔

(۴) تسلسل واستمرار

دعوت دین کی خارجی کوششوں کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس میں تسلسل اور تواتر ہونا چاہیے۔ صبر اور عزیمت کی تعلیم بھی اسی لیے دی گئی ہے۔ انبیائے کرام ابتدائے دعوت سے آخر تک (یا جب تک عذاب الٰہی نہیں آگیا) مسلسل اس کام میں لگے رہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّ نَهَارًاۙ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ○ وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ ○ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ ○ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۙ ○ (نوح: ۵-۹)

"(نوحؑ نے عرض کیا) اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا، مگر میری پکارنے ان کے فرار میں ہی اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انھیں معاف کردے انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی، پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔"

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

(العنکبوت: ۱۴)

"اور ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ وہ ان میں ساڑھے نو سو سال تک رہے۔ پھر تو انھیں طوفان نے دھر پکڑا اور وہ تھے بھی ظالم۔"

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کے جہد مسلسل اور صبر و استقامت کا کتنا عمدہ نقشہ کھینچا ہے، جو داعیان حق کے لیے مہمیز ہے۔

دعوت کے تسلسل اور استمرار کے ذیل میں یہ نکتہ واضح رہے کہ اللہ کو یہ بات پسند نہیں

ہے کہ داعی مایوس ہو کر بیٹھ جائے یا اتمام حجت سے پہلے انھیں عذاب الٰہی کا مورد (Target) سمجھ کر خود، راہ فرار اختیار کر لے۔ رسول اللہ ﷺ کو نصیحت کی جا رہی ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ ۘ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ۝ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ۝ (القلم: ۴۸، ۴۹)

''پس تو اپنے رب کا فیصلہ ہونے کا صبر سے (انتظار کر) اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جا جب کہ اس نے غم کی حالت میں دعا کی۔ اگر اسے اس کے رب کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو یقیناً وہ برے حالوں میں چٹیل میدان میں ڈال دیا جاتا۔''

فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرنے کی تشریح مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی وہ وقت ابھی دور ہے جب اللہ تعالیٰ تمھاری فتح و نصرت اور تمھارے ان مخالفین کی شکست کا فیصلہ فرما دے گا۔ اس وقت کے آنے تک، جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی اس دین کی تبلیغ میں پیش آئیں انھیں صبر کے ساتھ برداشت کرتے جاؤ۔'' (۶۰) یعنی گھبرا کر اپنا کام بند نہ کر دو۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ نہ آپؐ مایوس ہوئے اور نہ آپؐ نے ہمت ہاری، یہاں تک کہ اللہ نے حسب وعدہ آپؐ کا آوازہ چار دانگ عالم میں پھیلا دیا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ (آل عمران: ۱۳۹)

''دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی کام یاب ہو گے۔''

(۵) انتخاب افراد اور تربیت

اہل ایمان کی صفت اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ (الشوریٰ: ۳۸)

''جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

چند مشاہیر صحابہ اور ان کے حالات زندگی

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

اول الاسلام، مزاج شناس شریعت، راز دار نبیؐ، خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کی ذات گرامی وہ ہے کہ جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نورِ نبوت سے مستنیر ہے۔ آپؓ کی منقبت قلم کی طاقت اور روشنائی کی بساط سے باہر ہے۔

آپ کا نام عبداللہ، کنیت ابوبکر اور لقب عتیق اور صدیق ہے۔ پہلا لقب رسولؐ کا دیا ہوا اور دوسرا حضرت جبریل علیہ السلام کا عطا کیا ہوا ہے کیوں کہ شب معراج انھوں نے فرمایا تھا کہ اس سفر کی تصدیق ابوبکر کریں گے۔ واضح رہے کہ فیضان الٰہی کے انعام یافتگان میں صدیق کا مرتبہ عین نبی کے بعد ہے:

> وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ؕ (النساء:٦٩)

> ''اور جو بھی اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے، جیسے نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ اور یہی بہترین رفیق ہیں۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ اصحاب فیل سے چالیس دن بعد پیدا ہوئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کی ولادت عام الفیل سے ڈھائی سال بعد ہوئی۔ آپؓ کی مدت خلافت بھی ڈھائی سال ہے، اس طرح آپ کی عمر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے برابر ہے۔ آپ رسول اللہؐ کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں۔ آپ نے بھی زمانۂ جاہلیت میں کبھی نہ شرک کیا نہ ہی جھوٹ، زنا اور مکی معاشرے میں رائج دوسری برائیوں میں ملوث ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عمر کے چالیسویں سال نبوت عطا ہوئی۔ ان پر ایمان لانے والے مردوں میں اولین نام حضرت ابوبکرؓ کا ہے۔ آپ کی تبلیغ سے حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت

عثمان بن عفانؓ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، جیسے اکابرین عشرۂ مبشرہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد آپ کے کاشانہ میں ہدایت کی روشنی جگمگاتی رہی کیوں کہ آپ نے اپنے گھر میں عبادت کے لیے ایک مسجد بنالی تھی (غالبًا یہ وہی جگہ ہے، جو آج بھی مسجد ابوبکر کے نام سے معروف ہے)۔

اسلام کی دعوت وتبلیغ کے زمانے میں جب مسلمانوں کے اوپر قریش کے مظالم بہت بڑھ گئے اور خصوصیت سے غلاموں اور لونڈیوں کو کفار نے ابتلاء وآزمائش کا نشانہ بنالیا تو آپؓ کے بے مثال جذبۂ ایثار نے ان کی دستگیری کی اور اپنے مال سے حضرت بلال حبشیؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ، حضرت ابوفکیہؓ، حضرت لبینہؓ، حضرت زنّیرہؓ، حضرت نہدیہؓ اور حضرت ام عبیسؓ کو خرید کر آزاد فرمایا۔

حضرت ابوبکرؓ تاجر اور مال دار شخص تھے لیکن قبولِ اسلام کے بعد ان کی ساری دولت دین کی اشاعت اور نصرت میں صرف ہوئی، یہاں تک کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ ''ابوبکر کے مال نے مجھ کو جو نفع پہنچایا ہے کسی اور کے مال نے نہیں پہنچایا۔'' آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''ابوبکر سے زیادہ مجھ پر کسی اور کا احسان نہیں ہے۔'' آپؓ کی عظمت و بزرگی پر قرآن بھی شاہد ہے:

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ (الحدید:۱۰)

''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ اور قتال کیا ہے وہ ان کے برابر نہیں، جنھوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ اور قتال کیا۔ ان کے درجے بہت بڑے ہیں۔''

حضرت ابوبکرؓ جب تک مکہ میں رہے حضور ﷺ کے رفیق اور معاون رہے اور جب مدینے کو روانگی ہوئی تو رسولؐ کے یارِ غار ہونے کا قرآنی شرف آپؓ کو حاصل ہوا:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ

(التوبہ:۴۰)

''اگر تم ان کی مدد نہ کرو تو (کیا ہوا) اللہ ان کی مدد کر چکا ہے جب کافروں نے انھیں مکہ سے نکال دیا تھا۔ دو میں سے دوسرا جب کہ یہ دونوں غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے دو یتیم بچوں کی زمین کی قیمت خریداری مبلغ دس دینار ادا کرنے کا شرف بھی صدیق اکبرؓ کو حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں آپؓ شریک رہے۔ غزوۂ احد اور جنگ حنین میں جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ چند دیگر صحابہ کے ساتھ حضورؐ کی جاں سپاری میں حاضر رہے۔ غزوۂ خندق میں لشکر کے ایک حصہ کی کمان آپ کے ہاتھ میں تھی۔ ۹ ھ کے اولین حج میں رسول اللہ ﷺ نے آپ کو امیر الحاج مقرر فرمایا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت میں آپ ہی نے بہ حکم رسولؐ تین دن تک مسجد نبوی میں امامت فرمائی تھی، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ خلیفۂ رسولؐ ہونے کا استحقاق آپ ہی کو حاصل ہے۔

حضورؐ کے بعد اللہ نے آپ ہی کے ذریعے سے امت کو فتنے سے محفوظ رکھا ورنہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو رسول اکرم ﷺ کی وفات حسرت آیات کا یقین نہیں تھا اور یہ آپ ہی کی ذات بابرکات تھی، جس کی خلافت پر پوری امت متفق ہوگئی اور فتنۂ اختلاف کی جڑ کٹ گئی۔

اللہ نے آپ کو حب رسولؐ کے ساتھ عزم و استقامت کی وہ قوت عطا فرمائی تھی کہ زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی آپ نے جیش اسامہ کو روانہ فرمایا، جس نے رومیوں پر مسلمانوں کی دھاک جما دی۔ پھر آپ ہی کی ذات تھی، جس نے مانعین زکوٰۃ کی سرکوبی کی اور اسود عنسی، طلیحہ اسدی اور مسیلمہ کذاب، جیسے مدعیان نبوت کا قصہ پاک کر کے اسلام کی حدود کو پورے جزیرۃ العرب تک پھیلا دیا۔ آپؓ کے زمانۂ خلافت میں، جس کی میعاد صرف ڈھائی سال ہے، اسلامی فتوحات کا سیلاب عراق میں عین التمر اور فرائض تک، وادیِ شام میں دومۃ الجندل اور شام میں اجنادین تک پہنچ گیا۔ ان تمام جنگوں میں اسلامی افواج کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں ایک تہائی سے زیادہ کبھی نہیں رہی، لیکن ایمانی قوت اور صدیقی تدبیر نے انھیں کبھی شکست سے دوچار نہیں ہونے دیا۔

آپؓ کے آخری دو کارناموں میں ایک وفات کے وقت بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کی تقرری ہے، جس کی وجہ سے امت بعد میں فتنوں سے محفوظ رہی۔ دوسرا کارنامہ وظیفہ کے اس قلیل رقم کی واپسی کی وصیت ہے، جسے اکابر صحابہؓ نے بہ طور روزینہ کے آپ کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسی پر فرمایا تھا کہ ابوبکرؓ اپنے بعد والوں کو بڑی آزمائش میں ڈال گئے۔

کاروبارِ خلافت کی انجام دہی کے لیے آپ نے اکابر صحابہ کی مجلس شوریٰ قائم کی۔ آپ کے جوہر مردم شناس نے مدینہ کو چھوڑ کر، جو بہ راہ راست خلیفہ کے تحت تھا، مملکت اسلامیہ کے سولہ صوبوں میں، جو عاملین مقرر کیے، ان پر کبھی کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا۔ عمال کی تقرری میں آپ نے اقرباء پروری سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھا، جس کی وجہ سے کوئی بے اعتدالی (Corruption) راہ نہیں پاسکی۔ آپؓ نے صوبوں میں قاضی اور مرکز میں بیت المال کے انتظام وانصرام کے لیے وزارت خزانہ قائم کیا۔ آپؓ نے آں حضور ﷺ کے وعدوں اور پیشین گوئیوں کی تکمیل کی۔ غنائم کی تقسیم میں آپ نے ہمیشہ مساوات کو ملحوظ رکھا۔ آپ عوام الناس اور عمال حکومت کو تقویٰ کی نصیحت اور شرک وبدعات سے اجتناب کی وصیت کیا کرتے تھے۔

آپؓ کے دور خلافت کا عہد ساز کارنامہ جمع وتدوین قرآن ہے۔ دراصل قرآن، قراء اور حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا، لیکن پورا قرآن مرتب طور سے ایک صحیفہ میں جمع نہیں تھا۔ چوں کہ اللہ نے وحی کو ''القرآن'' (پڑھی جانے والی چیز) کے علاوہ ''الکتاب'' لکھی جانے والی چیز بھی کہا ہے اور یہ کتاب الٰہی کے ابدی حفاظت کی آسمانی تدبیر ہے اس لیے خلیفۂ رسولؐ نے حفظ اور اجزائے مکتوبہ کے توافق کے لیے قراء اور کاتبوں کی ایک جماعت کو مقرر فرمایا، جنھوں نے کافی محنت اور کوشش سے پورے قرآن کے تمام اجزا، جو کہیں نہ کہیں منتشر حالت میں محفوظ تھے یکجا کر کے ایک مصحف کی شکل میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ کر دیا۔ یہ بات بے خوف وخطر کہی جاسکتی ہے کہ آج، جو قرآن ہم پڑھ رہے ہیں وہ اسی ترتیب تلاوت کے ساتھ ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ یہ سارا کام ہدایت الٰہی ہی کے تحت ہوا تھا کیوں کہ اللہ نے خود فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر:۹)

''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

آپ کے فضائل ومحامد بے شمار ہیں۔ آپ کی ذات گرامی اگر نہ ہوتی تو امت کا اس فتنے میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا کہ معاذ اللہ رسولؐ کی وفات ہی نہیں ہوئی ہے۔ نبیؐ کے بعد امت میں افضل ترین ذات آپ ہی کی ہے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے محبوب ترین، اول الاسلام اور یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دائیں جانب ابوبکرؓ اور بائیں جانب حضرت عمرؓ ہوں گے۔

یہ بھی کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ جنت کے اعلیٰ علیین میں ہوں گے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ جنت میں ادھیڑ عمر والوں کے سردار ہیں۔ زمین میں ابوبکرؓ اور عمرؓ رسولؐ کے وزیر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میرے بعد تم ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتدا کرو۔ نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھ کو نہ پاؤ تو ابوبکرؓ کے پاس جاؤ۔ آپ کو نیکی کے کاموں میں عمرؓ پر سبقت حاصل ہے۔ آپ امت میں سب سے زیادہ رحم دل ہیں۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی عدم موجودگی اور آپؐ کے مرض الموت میں تمام صحابہ کی امامت فرمائی ہے۔ آپؓ کی خلافت پر رسول اللہ ﷺ کے اشارے موجود ہیں۔ آپؓ نے اپنے کل مال کا صدقہ دیا ہے۔ امت کے لیے بہترین خلیفہ یعنی حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کر جانا بھی آپ کے فضائل میں ہے۔

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

دوسرے خلیفۂ راشد، آں حضور ﷺ کی دعائے ہدایت کے مہبط، تاریخ مملکت کے فاتح اعظم کی شخصیت وہ ہے، جس کا مثل اعدائے اسلام بھی تاریخ میں کسی کو نہیں پاتے۔ ایک مغربی مصنف مائکل ہارٹ نے دنیا کے ایک سو اہم ترین آدمیوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے، اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کو پہلا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اکیاونواں نمبر دیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خاندان بنی عدی سے تھے، جن کے والد کعب سے رسول اللہ ﷺ کا شجرۂ نسب مل جاتا ہے۔ اکابرین قریش میں اس خاندان کے ذمہ سیادت (اور منافرہ) کا صیغہ تھا۔ اس طرح سیاست (Diplomacy) اور عدالت (Justice) آپ کی خاندانی وراثت تھی۔ آپ ہجرت نبویؐ سے چالیس سال قبل پیدا ہوئے۔ مدت خلافت دس سال سے کچھ کم تھی۔ اس طرح شہادت کے وقت آں حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرح آپؓ کی عمر بھی ترسٹھ سال تھی۔

بچپن میں عرب کی روایات کے مطابق حضرت عمرؓ اونٹ چرایا کرتے تھے۔ خلافت کے زمانے میں ایک بار اس چراگاہ کی طرف سے گزر ہوا تو آپؓ کو وہ زمانہ یاد آ گیا اور عبرت آمیز کلمات زبان پر جاری ہو گئے۔ آپؓ کو پہلوانی، کشتی اور شہسواری کے فن میں کمال حاصل تھا۔ قریش نے آپؓ کو سفارت کا منصب دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؓ کو قوت تقریر حاصل تھی۔ شعر فہمی کا ذوق اعلیٰ تھا اور بہت سے شعرا کے اشعار یاد تھے۔ آپؓ قریش کے ان سترہ آدمیوں

میں سے تھے، جو نوشت وخواند سے واقف تھے۔ جوانی میں آپ نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی زید زمانۂ ماقبل اسلام میں بھی موحد تھے۔ جب حضرت عمرؓ ستائیس سال کے تھے تو حضرت محمد ﷺ کو نبوت عطا ہوئی۔ ان کے خاندان میں زید کے فرزند سعید اور ان کی بیوی فاطمہ (جو حضرت عمرؓ کی بہن تھیں) پہلے ایمان لے آئیں۔ آپ کی ایک کنیز لبینہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت حضرت عمرؓ کو اسلام سے اتنی نفرت تھی کہ اس لونڈی کو بے تحاشہ مارتے تھے، یہاں تک کہ تھک جاتے تھے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ کا قصہ پاک کرنے کے ارادے سے نکلے لیکن ان کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ پہلے یہ اپنی بہن کے گھر گئے اور وہاں سے اسلام کی تڑپ لیے ہوئے، دار ارقم میں حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے۔ آپؓ سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لا چکے تھے۔ ان دونوں کے ایمان لانے سے مسلمانوں کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے آں حضور ﷺ سے پہلے ہجرت کی اور اطراف مدینہ میں رفاعہ بن عبد المنذر کے یہاں قیام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مواخاۃ کے وقت حضرت عمرؓ کو عتبان بن مالک کا بھائی بنایا، جو قبیلہ بنو سالم کے سردار تھے۔ حضور ﷺ سے کسب فیض کے لیے عمرؓ اور عتبانؓ نے باری مقرر کر لی تھی۔

مدینہ پہنچنے کے بعد تاریخ اسلام کا کوئی واقعہ ایسا نہیں تھا، جس میں حضرت عمرؓ شریک نہ رہے ہوں، اس لیے سیرت کے تمام واقعات میں حضرت ابوبکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ کا نام بھی ہر جگہ آتا ہے۔ آپؓ تمام جنگوں میں شریک رہے۔ اسیران بدر کے بارے میں آپؓ کی رائے یہ تھی کہ انھیں قتل کر دیا جائے، لیکن رحمۃ للعالمین ﷺ نے انھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ جنگ بدر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت عمرؓ کے خاندان بنو عدی کا ایک متنفس بھی قریش مکہ کی طرف سے لڑائی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ غزوۂ احد میں پاؤں اکھڑ جانے کے بعد جب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ حضور ﷺ زندہ ہیں تو پروانہ وار آپؐ کے گرد جمع ہونے والوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ حضرت عمرؓ ہی نے ابوسفیان کے ہبل کی جے جے کار کے جواب میں آں حضور ﷺ کے حکم پر الله اعلی و اجل (اللہ بلند و برتر ہے) کا نعرہ لگایا تھا۔ حضرت عمرؓ کو یہ شرف اسی غزوہ کے بعد حاصل ہوا کہ آپ کی صاحب زادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضور ﷺ کے حریم اقدس میں داخل ہوئیں۔

۴ھ میں یہودیوں کے قبیلہ بنونضیر کے پاس جب رسول اللہ ﷺ تعمیل معاہدہ کے لیے تشریف لے گئے تو ابوبکرؓ کے ساتھ عمرؓ کو بھی لے گئے تھے۔ اس معاملے میں بنونضیر کے انکار پر انھیں مدینے سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ جنگ خندق میں بھی حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے لشکر کے ایک حصے کی کمان سنبھالی تھی اور حضرت زبیرؓ کے ساتھ مل کر کافروں کے ایک حملے کو روکا اور ان کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا تھا۔ اسی حملے میں اسلامی لشکر، اور آں حضور ﷺ کی نماز عصر قضا ہوئی تھی۔

عمرۂ حدیبیہ کے موقعے پر جب صحابۂ کرام غیر مسلح شکل میں عازم مکہ ہوئے تھے تو حضرت عمرؓ ہی کے مشورے پر آں حضورؐ نے احتیاطاً مدینے سے ہتھیار منگوا لیے تھے۔ جب حدیبیہ میں قریش مکہ اور آں حضرتؐ کے درمیان صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت عمرؓ کو اس کی بعض دفعات انتہائی توہین آمیز معلوم ہوئیں اور انھوں نے آں حضورؐ سے پر جوش انداز میں گفتگو کی۔ لیکن جب غلطی کا احساس ہوا تو بڑی ندامت ہوئی اور کفارہ کے طور پر انھوں نے نفلیں پڑھنے کا اہتمام کیا اور غلام آزاد کیے۔

جب آیت: وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (الممتحنہ:۱۰) ''اور کافرہ عورتوں کو روک کر نہ رکھو۔'' نازل ہوئی تو آپ نے فوراً اپنی دو کافرہ بیویوں، قریبہ اور ام کلثوم بنت جردل کو طلاق دے دی۔ غزوۂ خیبر میں جب حضورؐ نے یہ فرمایا کہ کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا، جو حملہ آور ہوگا تو آپ کی زبردست خواہش ہوئی کہ کاش یہ علم انھیں ملتا لیکن یہ سعادت حضرت علیؓ کے حصے میں آئی۔ بنوبکر کے نقض عہد اور قریش مکہ کی بدعہدی کی وجہ سے جب حدیبیہ کی صلح باطل ہوگئی تو ابوسفیان تجدید صلح کے لیے مدینہ آیا اور مختلف صحابہؓ کے علاوہ حضرت عمرؓ سے بھی اس نے استمداد کی، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ فتح مکہ کے موقعے پر جب حضرت عباسؓ، ابوسفیان کو لے کر حضورؐ کے پاس جا رہے تھے تو اگر عجلت نہ کرتے تو حضرت عمرؓ اسے یقیناً قتل کر دیتے۔ فتح مکہ کے موقعے پر آں حضورؐ کی طرف سے عورتوں کی بیعت حضرت عمرؓ ہی نے لی۔ غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کا لشکر پراگندہ ہوگیا تو اس وقت حضورؐ کے جاں نثاروں میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقعے پر آپ نے اپنی نصف دولت لشکر اسلام کی نذر کی تھی۔ واقعۂ ایلاء کے وقت انھیں کی ہمت تھی کہ ازواج مطہرات سے گفتگو کرتے، لیکن ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے ڈانٹ ڈپٹ کر آپ کی ہمت شکنی کر دی۔

سرکار دو عالم ﷺ سے آپ کو اتنی محبت تھی کہ ان کی وفات کے وقت تلوار کھینچ کر کھڑے ہوگئے کہ، جو کہے گا کہ حضور ﷺ وفات پا چکے ہیں اس کی گردن اڑا دیں گے یہاں تک کہ رازدار شریعت حضرت ابوبکرؓ نے آپ کو اس سے روکا۔ اس کے بعد اگر آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے میں سبقت نہ کی ہوتی تو امت یقیناً فتنہ میں مبتلا ہو جاتی۔ جیش اسامہ کی روانگی کے وقت حضرت ابوبکرؓ نے آپؓ کو اپنی مدد کے لیے روک لیا تھا۔ مانعین زکوٰۃ اور مرتدین سے مقابلہ کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کی عزیمت کی انھیں کو تصدیق کرنی پڑی۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ برابر ان کے مشیر کار رہے۔ آپؓ کی معاملہ فہمی، تدبر، استقامت، تفقہ، قرآن فہمی، تقویٰ اور حضورؐ سے تعلق خاطر کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے آپؓ کو اپنا جانشین خلیفہ نامزد فرمایا۔ پوری امت اور دنیا نے دیکھا کہ یہ تقرری کتنی صحیح اور درست تھی۔

آپؓ کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کا ایک عظیم الشان سیلاب آ گیا اور آدھی دنیا پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ فلسطین، شام، الجزیرہ، عراق عرب، عراق عجم، خوزستان، آذربائیجان، طبرستان، آرمینیا، فارس، کرمان، سیستان، مکران، خراسان، مصر اور اسکندریہ فتح ہوگئے۔

حضرت عمرؓ کو ایک مجوسی غلام فیروز نے جو ابولؤلو کے نام سے جانا جاتا تھا، مسجد نبوی میں جب وہ نماز فجر کی امامت کر رہے تھے، خنجر سے پے در پے چھ وار کر کے سخت زخمی کر دیا، یہاں تک کہ تین دن بعد آپؓ کی موت ہوگئی۔ وفات کے وقت آپؓ کے اوپر چھ ہزار درہم کا قرض تھا۔ یہ قرض ان کا مسکونہ مکان بیچ کر ادا کیا گیا، جو مسجد نبوی کے باب السلام اور باب الرحمۃ کے درمیان دارالقضاء کے نام سے عرصے تک مشہور رہا۔ وفات سے پہلے آپؓ نے حضرت عائشہؓ سے ان کے حجرہ میں رسول پاک ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت مانگی اور وہیں دفن کیے گئے۔

آپؓ کا دور خلافت انتہا درجے کا حامل ہے۔ ایک وسیع مملکت کے نگراں ہونے کی وجہ سے آپؓ نے جہانگیری اور جہانبانی کے وہ آداب مقرر فرمائے، جن کی بنیادیں قرآن اور سنت میں پیوست تھیں اور جو بعد میں اسلام کے اصول حکمرانی کے طور پر فقہ کی کتابوں میں مدون ہوئیں۔ آپؓ ہی نے سب سے پہلے امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا اور بیت المال قائم کیا۔ آپؓ نے انتخاب خلیفہ میں اہل الذکر کی شوریٰ (جمہوریت) کا اصول اختیار کیا اور حضرات علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ،

طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی اور یہ ہدایت کردی کہ چھ دنوں کے اندر آپس کے مشورے سے انھیں میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیا جائے۔ ان کے بیٹے حضرت عبداللہؓ مشورہ میں شریک رہ سکتے ہیں، لیکن وہ خلیفہ نہیں منتخب ہو سکتے۔ بالآخر کافی ردو کد کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ چنا گیا۔

آپؓ امامت واجتہاد کے درجے پر فائز تھے۔ بہت سے مسائل میں آپؓ نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ توحید کے عاشق تھے۔ آپ نے اپنے عہد خلافت میں ان آثار کو مٹایا، جن سے امت میں فتنہ پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ آپ نے بیعت الرضوان والے درخت کو کٹوادیا۔ حجر اسود کو بوسہ دینے کا سبب صرف اتباع سنت کو بتایا اور قبۃ الصخرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے انکار کردیا۔

آپؓ تواضع، سادگی، زندہ دلی، اصول پسندی، اولاد کی محبت اور اہل کمال کی قدردانی میں ممتاز، نیز عدل وانصاف کی مجسم تصویر تھے۔ مساوات انسانی کی قدروں پر عامل اور غلامی کا رواج کم کرنے والے تھے۔ آپ نے رومیوں اور ایرانیوں کے معمولات کے برخلاف مفتوحہ ممالک کی رعایا کو آزادی دی۔ بلاشبہ آپؓ کو روئے زمین کے تمام حکمرانوں پر ترجیح اور برتری حاصل ہے۔

آپؓ کے فضائل اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ عمرؓ کے اسلام پر حضرت جبریلؑ گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق کو جاری کردیا ہے۔ عمرؓ سے بہتر کسی شخص پر سورج طلوع نہیں ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کی فضیلت میں یہ بھی فرمایا کہ ''ہمیں اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کیجیے۔'' رسول اللہ ﷺ نے آپ کو ''میرے بھائی'' کہا ہے۔ آپؓ، رسول اللہ ﷺ کی اس دعا کے مخاطب ہیں کہ اللہ ابوجہل یا عمر میں کسی ایک سے اسلام کی مدد فرما اور بالآخر حضرت عمرؓ مشرف بہ ایمان ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ''عمر جس راستے سے گزریں اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا۔'' آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''اے عمر! شیطان تم سے ڈرتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کا خواب دیکھنا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ ان کے خلیفہ ہوں گے، ان بزرگوں کی فضیلت کی دلیل ہے۔ فرمان رسولؐ ہے کہ ''اللہ کے دین کے معاملے میں عمر سب سے سخت ہیں۔'' ابوبکرؓ نے آپؓ ہی کے کہنے پر حضرت زید بن ثابتؓ کو قرآن جمع کرنے کا حکم دیا۔ آپ عشرۂ مبشرہ میں ہیں۔ حضرت عمرؓ کا خود یہ فرمانا کہ

تین بار ان کے قول کے مطابق وحی الٰہی نازل ہوئی، جس میں ایک اذان کے حکم کی موافقت ہے، آپؓ کی فضیلت کی دلیل ہے۔ آپ ہی نے نماز تراویح باجماعت کی ابتدا کی۔

(۳) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

خلیفۂ ثالث، داماد رسولؐ حضرت عثمان بن عفانؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں والد اور والدہ دونوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ کنیت ابوعبداللہ اور ابوعمر تھی۔ ہجرت مدینہ سے ۴۷ سال قبل مطابق ۵۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مکہ کے ان چند لوگوں میں سے تھے، جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ تجارت کے پیشے میں اس قدر کام یاب تھے کہ آپ کا لقب ہی ''غنی'' ہوگیا تھا۔ انتہائی نیک، پاک باز، ایمان دار اور عفو و کرم کی صفت سے متصف تھے۔ عہد جاہلیت میں بھی نہ شراب پی، نہ ہی جوا، یا زنا کی آلودگی میں ملوث ہوئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چوتھا تھا۔ مکہ میں آپ کا نکاح حضورؐ کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد مدینہ میں دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ حبالۂ عقد میں آئیں۔ اس کی وجہ سے آپؓ کا لقب ذوالنورین ہوگیا۔ اسلام لانے کے بعد اہل خاندان کی طرف سے مصائب اور شدائد کا شکار رہے۔ اس کی وجہ سے حبشہ اور مدینہ دونوں جگہ ہجرت کرنے کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی۔ حضرت رقیہؓ کی علالت کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شرکت سے محروم رہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے ایک مجاہد کا حصہ آپ کو عطا فرمایا۔ اس کے بعد تو تقریباً تمام ہی غزوات میں شرکت رہی۔ عمرۂ حدیبیہ کے موقعے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر بن کر مکہ گئے۔ وہاں روک لیے جانے کی وجہ سے ہی بیعت رضوان ہوئی، جس میں رسولؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو آپ کا ہاتھ فرض کر کے آپ کی بیعت قبول فرمائی۔ غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیرون مدینہ جانے پر دوبار آپ کو نیابت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ صحابہؓ میں سب سے زیادہ مال دار شخص تھے۔ آپ جہاد کے مواقع پر ہمیشہ حسب حیثیت سب سے زیادہ مدد فرماتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقعے پر آپؓ نے لشکر اسلام کی تیاری میں اتنا حصہ لیا کہ آپؓ کا نام ہی ''مجهز جيش العسرة'' ہوگیا۔ مختلف روایات کو جمع کرنے سے اس غزوہ میں آپ کے داد و دہش کی مقدار درج ذیل ٹھہرتی ہے۔

دوسو اوقیہ چاندی، سات سو اوقیہ سونا، ایک ہزار دوسو اونٹ، ستر ہزار گھوڑے، ایک ہزار دینا اور ستر ہزار درہم نقد۔

آپ کی اس فراخ دلی سے رسول اللہ ﷺ کو اس قدر مسرت ہوئی کہ آپؐ نے فرمایا: ما علی عثمان من عمل بعد الیوم یعنی ''آج کے بعد سے عثمان کو کوئی عمل نقصان نہ پہنچائے گا۔'' مدینہ میں مسلمانوں کو پانی کی بہت تکلیف تھی اس لیے حضرت عثمانؓ نے ایک خطیر رقم کے عوض بئر رومہ کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نوشت وخواند کی صلاحیت رکھتے تھے اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنا کاتب مقرر کیا تھا۔ آپؓ نے حضرت عمرؓ کی جانشینی کی وصیت حضرت عثمانؓ ہی سے لکھوائی تھی۔ حضرات شیخینؓ کے زمانے میں حضرت عثمانؓ ان کی شوریٰ کے اہم رکن رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کا اس درجہ اکرام اور لحاظ فرماتے کہ صحابۂ کرام خلیفہ سے گفتگو کے لیے آپؓ ہی کو واسطہ بنایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے منصب خلافت کے لیے، جن چھ لوگوں کو نامزد کیا تھا اس میں آخری فیصلے کے طور پر حضرت عثمانؓ ہی کو جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔

آپؓ کا زمانۂ خلافت بارہ طویل سالوں پر مشتمل ہے، جو کہ خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے ابتدائی چھ سالوں میں اسلام کی فتوحات کا سیلاب مصر سے آگے بڑھ کر براعظم افریقہ کے مغربی ساحل پر مراکش اور پھر اندلس (Spain) کے ساحلوں تک پہنچ گیا اور اس کی لہریں بحر روم میں تلاطم برپا کرتی ہوئی قبرص (Cyprus)، رہوڈیشیا (Rhodes) اور صقلیہ (Sicily) کے جزائر پر چڑھ گئیں۔ سواد عراق میں خراسان، مشرق میں سیستان اور کابل نیز شمال میں آذربائیجان اور آرمینیا تک فتوحات کا سلسلہ دراز ہوا۔

حضرت عثمانؓ نے حسب وصیت خلیفۂ سابق ایک سال تک حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ عاملوں کو بحال رکھا، لیکن بعد میں جب انھوں نے گورنروں کی تقرری میں اپنی خواہش اور رائے سے تصرف کرنا شروع کیا تو لوگوں کو آہستہ آہستہ شکایتیں پیدا ہوتی گئیں، جس نے بعد میں فتنۂ عظیم کی شکل اختیار کرلی۔ چوں کہ آں حضرت ﷺ اس فتنہ کی پیشین گوئی کر چکے تھے اور آپؓ کو نصیحت کر چکے تھے کہ ''تم کو ایک قمیص پہنائی جائے گی، تم اسے اپنی مرضی سے نہ اتارنا''، اس لیے آپؓ نے باغیوں کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ آپؓ نے دیار رسولؐ میں خونریزی بھی پسند نہیں

کی اور صحابۂ کرام کو باغیوں سے جنگ کرنے سے روک دیا، جس کے نتیجے میں آپ کی انتہائی مظلومانہ شہادت واقع ہوگئی۔ بہ وقت شہادت آپؓ کی عمر تراسی (۸۳) سال تھی۔

آپؓ سادگی، رقت قلب، جود وسخا، انداز گفتگو، عبادت، اتباع سنت، تقویٰ وطہارت، غلام آزاد کرنے، علم وفضل، دینی خودداری اور حمیت وغیرت میں ممتاز تھے۔ آپؓ کی حیا کا ذکر تو جمعہ کے خطبوں میں بھی ہوتا ہے ''و احیاھم عثمان''، کیوں کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ''عثمانؓ سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''

آپؓ کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں۔ آپ ان دس اصحاب رسولؐ میں سے ہیں، جن کو دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ بشارت بھی ہے کہ آپ جنت میں رسول اللہ ﷺ کے رفیق ہوں گے۔ پیشین گوئی ہے کہ ایک فتنہ برپا ہوگا، جس میں آپ راستی پر ہوں گے۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے آپ کی تزویج جبریل علیہ السلام کے واسطے سے ہوئی تھی۔ آپ یکے از جامعین قرآن ہیں۔ آپؓ کا سب سے بڑا کارنامہ پوری امت کو قرآن کریم کی ایک تلاوت پر جمع کرنا ہے۔ جب آپؓ نے دیکھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور عجم کے لوگ قرآن کا تلفظ اپنے اپنے طور پر کرنے لگے ہیں اور اس طرح تحریف قرآن کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے تو صحابۂ کرام کے مشورہ سے آپؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ صحیفے کی سات نقلیں کرا کے ایک نسخہ مدینہ میں رکھا اور بقیہ کو مکہ، بحرین، یمن، شام، کوفہ اور بصرہ کو بھیج دیا۔ اس طرح اختلاف قراءت کے فتنے کی جڑ کٹ گئی۔

(۴) حضرت علی مرتضیٰؓ

چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوالحسن اور ابوتراب، لقب حیدر (شیر)، والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہؓ تھا۔ آپؓ نجیب الطرفین ہاشمی اور رسول اللہؐ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ آپؓ کے والد ابوطالب مکہ کے ذی اثر سردار تھے اور رسول اللہ ﷺ کو اپنی رسالت کے ابتدائی دور میں ان کی حمایت حاصل تھی۔ فاطمہ بنت اسدؓ مسلمان ہوئیں اور مدینہ ہجرت کی۔ ان کی وفات کے وقت رسول اللہ ﷺ نے کفن میں اپنی قمیص پہنائی تھی اور برکت کی خاطر ان کی قبر میں لیٹے بھی تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بعثت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد ابو طالب کثیر العیال اور قلیل الکفاف تھے اس لیے ان کی پرورش کی ذمے داری رسول اللہ ﷺ نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ آپؓ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ قبول اسلام کے بعد تیرہ سال رسول اللہ ﷺ کی آغوش تربیت میں بسر ہوئے اس لیے اسلام آپؓ کی رگوں میں خون بن کر گردش کرنے لگا۔ تبلیغ اسلام میں حضورؐ کو حضرت ابو بکرؓ کی رفاقت حاصل تھی لیکن کبھی کبھی صغر سنی کے باوجود حضرت علیؓ بھی آپؐ کے ہمراہ ہوتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے آیت: وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ (الشعراء:۲۱۴) ''اور اپنے قرابت داروں کو ڈراؤ'' کے تحت اپنے خاندان والوں کو اسلام کی دعوت دی تو صرف آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ ہجرت کی رات جب کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا، آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا تھا اور بہ فضل الٰہی صاف بچ کر نکل گئے تھے۔ حضرت علیؓ بعد میں آپؐ کی ہدایت کے بہ موجب لوگوں کی امانتیں واپس کر کے مدینہ آ گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مواخات میں آپؓ کو اپنا بھائی بنایا تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر میں آپؓ اینٹ اور گارا لا کر دیتے تھے۔

آپؓ نے تمام غزوات میں شرکت کی۔ ۲ھ میں جنگ بدر کے موقعے پر آپ نے پہلے سے پہنچ کر تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ پھر انفرادی مقابلے میں پہلے ولید کو تہ تیغ کیا، بعد میں عبیدہ کی مدد کی اور ان کے حریف شیبہ کو بھی قتل کر دیا۔ اسی سال آپؓ کا نکاح حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے ہوا۔ سامان نکاح اور مہر کی ادائی کے لیے آپؓ نے رسول خداؐ کے حکم سے اپنی زرہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ چار سو درہم کے عوض فروخت کر دی۔ دس مہینے کے بعد جب آپؓ خاتون جنتؓ کو رخصت کرا کے گھر لے آئے تو اسی کی بقیہ رقم سے ولیمہ کیا۔ حضرت فاطمہؓ کے لیے آپؓ نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شادی بیاہ میں سارا خرچ اور مکان کا انتظام مرد کو کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کی گھریلو ضروریات کے لیے، جن چند چیزوں کا انتظام فرما دیا تھا وہ صحابۂ کرام کی طرف سے تحفہ تھا، جو اس لیے دیا گیا تھا کہ حضور ﷺ ہی نے حضرت علیؓ کی بھی پرورش فرمائی تھی اور مدینہ میں آپ ﷺ کی حیثیت بڑے بھائی کی تھی۔

غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو دوسرے مرحلے میں شکست ہوگئی تو حضرت مصعب بن عمیرؓ کی شہادت کے بعد اسلامی علم کو حضرت علیؓ ہی نے سنبھالا اور مشرکین مکہ کے علم بردار ابوسعد بن ابی طلحہ کو زخمی کر کے گرا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس غزوہ میں سخت زخم آئے تھے۔ آپؓ اپنی ڈھال میں پانی لاتے تھے اور حضرت فاطمہؓ اپنے ہاتھوں سے دھوتی تھیں۔ غزوہ بنی نضیر میں بھی اسلامی علم آپؓ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس جنگ کے نتیجے میں بنونضیر کو جلاوطن ہونا پڑا۔ جنگ احزاب میں جب عمرو بن عبدود، جیسا نامی پہلوان خندق کو پار کر کے اندر آ گیا تو آپؓ ہی نے اسے جہنم رسید کیا۔ غزوہ بنوقریظہ میں بھی علم بردار حضرت علیؓ تھے۔ اس جنگ میں بنوقریظہ کے تمام مردان جنگی کو قتل کیا گیا تھا۔

حدیبیہ کی صلح کے موقعے پر صلح نامہ حضرت علیؓ ہی نے لکھا تھا اور جب مشرکین نے لفظ "رسول اللہ" پر اعتراض کیا تو آپؓ نے اس لفظ کو محو کرنا غیرت اسلامی کے خلاف سمجھا۔ بعد میں رسول اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے یہ لفظ قلم زد کر دیا تھا۔ فتح خیبر کے وقت آپؓ کی آنکھوں میں آشوب تھا لیکن رسول گرامی ﷺ کے لعاب دہن لگانے سے اچھا ہو گیا۔ اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ آپؓ نے یہودی پہلوان مرحب کو قتل کیا اور خیبر کا قلعہ آپؓ کے ہاتھوں میں مفتوح ہوا۔

فتح مکہ کی تیاری کے زمانے میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے ایک عورت کی معرفت مکہ والوں کو ایک خفیہ خط بھیجا، جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دے دی۔ آپؐ نے اس عورت کی گرفتاری پر زبیرؓ، مقدادؓ اور علیؓ کو مامور کیا۔ آخر کار وہ خط اس عورت کے پاس سے برآمد ہوا۔ فتح مکہ کے وقت انصار کا ایک علم حضرت سعد بن عبادہؓ کے ہاتھ میں تھا لیکن جب انھوں نے رجز کا یہ شعر پڑھا کہ "آج شدید جنگ کا دن ہے، آج حرم میں خوں ریزی جائز ہے" تو رسول اکرم ﷺ نے علم ان کے ہاتھ سے لے کر حضرت علیؓ کے حوالے کر دیا اور کہا کہ "آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔" کعبہ کے بتوں کو توڑنے میں بھی حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ بٹایا تھا۔ غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے تھے تو اس وقت جن لوگوں نے پامردی دکھائی ان میں حضرت علیؓ بھی تھے۔

۹ ھ میں جب آں حضرت ﷺ نے تبوک کا قصد کیا تو اہل بیت اطہار کی حفاظت پر

آپ ؓ نے حضرت علیؓ کو مامور فرمایا۔ اور جب لوگوں کی طعنہ زنی سے پریشان ہوکر وہ تبوک کے راستے میں اسلامی لشکر سے جا ملے تو آں حضرت ﷺ نے واپس کرتے ہوئے ان کی دل جوئی یہ کہہ کر فرمائی کہ ان کی حیثیت وہی ہے، جو حضرت ہارونؑ کی موسیٰؑ کے لیے تھی۔ تبوک سے واپسی پر اسی سال حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحاج بنا کر مکہ روانہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب فوراً بعد ہی سورۂ براءت (التوبہ) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے نمائندہ کی حیثیت سے روانہ فرمایا تا کہ اللہ کے احکام لوگوں کو پہنچا دیں اور اعلان کر دیں کہ اگلے سال سے نہ تو کافروں کو حج کرنے دیا جائے گا نہ ہی کسی کو برہنہ طواف کرنے کا حق ہوگا۔ اس سے اگلے سال حضرت علیؓ کو سیاہ علم دے کر یمن روانہ کیا گیا جہاں آپؓ کی تبلیغ سے تمام لوگ مسلمان ہو گئے۔

۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعے پر آپؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ یہاں سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ علیل ہو گئے اور اسی علالت کے سبب ۱۲ر ربیع الاول بہ روز دوشنبہ آپ ﷺ کی رحلت کا حادثۂ فاجعہ پیش آیا۔ رحلت کے وقت حضرت علیؓ وہاں موجود تھے اور حضورؐ کے غسل اور تجہیز و تکفین کے مراحل آپؓ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے تھے۔ روایات سے ثابت ہے کہ دیگر جلیل القدر صحابہ بہ شمول شیخین نے اس مقدس کام میں حصہ لیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ثقیفہ بنو ساعدہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ مشہور روایات کے مطابق حضرت علیؓ نے چھ ماہ بعد جب بنت رسول اور آپؓ کی زوجہ حضرت فاطمہ زہراؓ کی وفات ہوگئی تب خلیفۂ رسول کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد امیر المؤمنین حضرت عمرؓ بغیر آپؓ کے مشورہ کے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ شہر ایلیا کی چابیاں لینے کے لیے وہاں کے اسقف اعظم کی درخواست پر بیت المقدس تشریف لے گئے تھے تو حضرت علیؓ ہی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ آپؓ کی ایک صاحب زادی ام کلثومؓ حضرت عمرؓ کے نکاح میں تھیں۔ ان باتوں سے اس مغالطے کی قلعی کھل جاتی ہے کہ حضرت علیؓ اور صاحبینؓ میں ان بن تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب مملکت اسلامیہ میں شورش برپا ہوئی تو آپؓ نے حضرت عثمانؓ کو نہایت صحیح اور مخلصانہ مشورے دیے۔ آپؓ نے مصر کے باغی وفد کو اپنی ذمے داری پر واپس کیا لیکن شر پسند ایک بہانہ کر کے واپس آ گئے۔ جب باغیوں نے حضرت

عثمانؓ کا محاصرہ کیا تو آپؓ نے بڑی کوشش کی کہ محاصرے میں شدت نہ پیدا ہو لیکن شر پسندوں نے سہولت دینے سے انکار کر دیا۔ آپؓ نے اپنے دونوں صاحب زادوں حضرات حسنؓ اور حسینؓ کو خلیفہ کی حفاظت پر مامور کیا لیکن جب اس کے باوجود باغیوں نے امیر المؤمنین کو شہید کر دیا تو آپؓ نے اپنے بیٹوں کی خبر لی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے تین دن بعد آپؓ نے لوگوں کے اصرار پر خلافت کا منصب قبول فرمایا۔ لیکن اب فتنوں کا دور شروع ہو چکا تھا۔ آپؓ حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص نہیں لے سکے کیوں کہ اصل قاتل کو حضرت عثمانؓ کی اہلیہ نائلہ بنت قرافصہ پہچان نہ سکیں اور محمد بن ابوبکرؓ نے بھی اس کی شناخت سے لاعلمی ظاہر کی۔ جہاں تک محمد بن ابوبکرؓ کا تعلق ہے انھوں نے اس کا اقرار کیا کہ وہ قتل کے ارادے سے گئے ضرور تھے لیکن قتل انھوں نے نہیں کیا۔ واضح رہے کہ اکثر روایتیں اس کی تائید نہیں کرتیں۔

چوں کہ حضرت علیؓ کے نزدیک فتنہ وفساد کا اصل سبب حضرت عثمانؓ کے ذریعہ غلط عمال کا تقرر تھا اس لیے انھوں نے حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عاملین کو معزول کر دیا، لیکن فتنہ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ ان کے مقرر کردہ عمال کو قبضہ حاصل کرنے میں کام یابی حاصل نہیں ہوئی۔ حضرت معاویہؓ کو شام، اردن اور فلسطین کی امارت حاصل تھی، وہ حضرت علیؓ کے اس فیصلے میں مزاحم ہوئے۔ اس عرصے میں حضرت عائشہؓ نے حضرات طلحہؓ و زبیرؓ کے ساتھ قتل عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے خروج کیا۔ حضرت علیؓ نے بھی مدینہ چھوڑا اور عازم عراق ہوئے۔ جنگ جمل میں جب حضرت عائشہؓ کی فوج کو شکست ہوئی تو حضرت علیؓ نے بھاگنے والوں کا پیچھا کرنے، انھیں قیدی بنانے اور غنیمت لوٹنے سے منع فرما دیا کیوں کہ آپؓ کے نزدیک یہ کفر وایمان کی جنگ نہیں تھی۔

جنگ جمل کے بعد آپؓ نے کوفہ کو دار الخلافہ بنا لیا۔ اس سے مدینہ کی سیاسی اہمیت ختم ہوگئی۔ آپؓ نے کوفہ میں اپنی حکومت مستحکم ہو جانے کے بعد حضرت معاویہؓ کو بیعت اور اطاعت کے لیے لکھا اور بہ صورت دیگر جنگ کی دھمکی دی۔ اس کا الٹا اثر ہوا اور صفین کی جنگ ہوئی۔ یہ جنگ دوستانہ طریقے پر ہوئی اور کچھ بزرگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا لیکن مفسدوں نے اپنی جان کے

خوف سے صلح نہ ہونے دی۔ آخر کار جنگ ہوئی اور اس کا فیصلہ اس بات پر ہوا کہ دونوں طرف سے ایک ایک حکم مقرر ہو اور وہ جو فیصلہ کردیں دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمرو بن عاصؓ حکم مقرر ہوئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں کی معزولی کا اعلان کر کے تیسرا آدمی خلافت کے لیے چنا جائے۔ چناں چہ پہلے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ممبر پر کھڑے ہوکر دونوں کی معزولی کا اعلان کیا، لیکن جب حضرت عمرو بن عاصؓ کی باری آئی تو انھوں نے حضرت علیؓ کی معزولی کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کردیا۔ اس تحکیم کا نتیجہ خانہ جنگی کی شکل میں ظاہر ہوا اور خوارج کا ظہور ہوا۔ جلیل القدر صحابہؓ نے اس فتنہ سے دامن کشی اختیار کی۔ خارجیوں نے اپنے پرتشدد مسلک کو منوانے کے لیے جنگ چھیڑ دی اور نہروان کا معرکہ پیش آیا۔ ان تمام جنگوں میں طرفین سے جتنے مسلمان مارے گئے وہ پوری دنیا کو فتح کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ کی حکمت عملی کے سبب ان کی قوت بڑھتی گئی اور حضرت علیؓ کی قوت گھٹتی گئی۔ خارجیوں نے علیؓ، معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ کو ایک ساتھ قتل کرنے کی سازش کی۔ مؤخر الذکر دو خوش قسمت تھے لیکن حضرت علیؓ کو ابن ملجم نے حالت نماز میں سخت زخمی کردیا، جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے اور اسی روز یعنی ۲۰؍رمضان ۴۰ھ جمعہ کی رات کو یہ فضل و کمال اور رشد و ہدایت کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ حضرت حسنؓ نے تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت علیؓ کا پورا دورِ خلافت شورش اور خانہ جنگی سے عبارت ہے۔ حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت سے، جس فتنے کا آغاز ہوا تھا وہ بڑھتا ہی گیا اور آخر کار اس فتنے نے خلافت کی جگہ ملوکیت قائم کردی۔ واضح رہے کہ صحابۂ کرامؓ اپنے فضل و کمال اور تقویٰ کے باوجود انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ انھوں نے غلطیاں بھی کیں اور بعض اوقات مسلسل سیاسی و اجتہادی غلطیاں کرتے گئے۔ یہ اللہ کی مشیت تھی کہ امت میں ایک ہی ابوبکرؓ اور ایک ہی عمرؓ ہو، جنھوں نے خود کو اسلام اور مسلمانوں کی بے لاگ خیر خواہی میں پوری عمر صرف کردی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے اپنے تمام معاملات بہ خوشی ان کے حوالہ کردیے۔ جب کہ بعد والوں نے امت کی

خیر خواہی اور بہتری کے لیے اپنی ذات کو اولیٰ سمجھا، جس کے نتیجے میں امت ان کے نام پر متفق نہ ہو سکی۔ ان مہلک نتائج تک پہنچنے میں حضرت عثمانؓ کی الطاف قرابت داری، حضرت معاویہؓ کی عنایات جانب داری اور حضرت علیؓ کے متشددانہ تقشف نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

حضرت علیؓ نے کاروبار خلافت کو حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ کے طریقے پر چلانا چاہا لیکن نظام خلافت اس وقت تک شاہراہ مستقیم سے اس قدر ہٹ چکا تھا کہ آپؓ کا ہر اصلاحی عمل صاحبان اقتدار کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گیا اور آپؓ کو کہیں سے تعاون نہ ملا۔

داخلی شورشوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؓ کے زمانے میں آرمینیا کے کچھ قبائل مرتد ہو گئے تھے۔ آپؓ نے سختی سے ان کی سرکوبی کی۔ خارجیوں اور سبائیوں کو سزا دینا بھی اسلام کی خدمت تھی، جو آپؓ نے انجام دی۔ آپؓ مسلمانوں کی اخلاقی نگرانی کا خیال رکھتے تھے اور جرم کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سزائیں تجویز کرتے تھے۔ اسی لیے آپؓ کے عدل کا ذکر خطبوں میں بھی ہوتا ہے (وَ اَقْضٰھُمْ عَلِیٌّ)۔

آپؓ نے متعدد شادیاں کیں، جن سے سترہ لڑکیاں اور چودہ لڑکے ہوئے۔ پانچ لڑکوں سے سلسلۂ نسل جاری رہا۔

آپؓ کے فضل کمال کے اظہار کے لیے فقط یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آپؓ آغوش نبوت کے پروردہ اور ساختہ و پرداختہ تھے۔ آپؓ قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ کے معتبر عالم تھے اور آپؓ کو اجتہاد میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اولین نمازیں پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ جن چار آدمیوں سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو محبت کرنے کا حکم دیا ان میں سے ایک آپ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے گھر کے علاوہ مسجد میں آنے کے دوسرے تمام راستے بند کرا دیے تھے۔ آپ اول المسلمین ہیں۔ فرمان رسولؐ ہے کہ ''مومن ہی آپ سے محبت کرتا ہے اور منافق ہی آپ سے بغض رکھتا ہے۔'' آپؐ کا یہ فرمانا بھی ہے کہ ''علی میرے لیے ایسے ہیں جیسے موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ (یعنی مددگار)۔'' آپ قرآن کے عالم تھے۔ تفقہ میں آپ کو حضرت عمرؓ پر فوقیت حاصل ہے۔ آپ یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اپنی جگہ سورہ توبہ کی ابتدائی آیات کے ساتھ حج کے موقعے پر حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجا تھا۔ اہل یمن کی طرف

آپ کو قاضی بنا کر بھیجا گیا۔ فتح خیبر کے موقعے پر پرچمِ اسلام آپ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ نے ہجرت کی رات امانتوں کی ادائے گی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی نیابت فرمائی تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فضائل آپ کو حاصل ہیں۔

(۵) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کی کنیت ام ہند تھی۔ سن شعور کو پہنچتے ہی اپنے پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے طاہرہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ آپ کے والد عام الفیل سے بیس سال بعد حرب فجار میں مقتول ہوئے تھے۔ آپ کا پہلا نکاح ابوہالہ بن نباش تمیمی سے اور دوسرا نکاح عتیق بن عابد مخزومی سے ہوا تھا۔ آپ مکہ کی بہت ہی کام یاب تاجرہ تھیں۔ جاہلیت کے زمانے میں بھی کاروبار کے لیے عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے کا دستور نہیں تھا اس لیے آپ اپنے اعزہ کی خدمات معاوضے پر حاصل کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب ان کا تجارتی قافلہ شام جا رہا تھا تو اپنے چچا ابوطالب کی تحریک پر حضرت محمد (ﷺ) جا کر ان سے ملے۔ اس وقت تک آپؐ کی امانت، حسن معاملت، راست بازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ چناں چہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے غلام میسرہ کے ہمراہ آپؐ کو اپنے مال تجارت کے ساتھ بصرہ روانہ کر دیا۔ اس سفر میں طاہرہ کو ہمیشہ کے مقابلہ میں دوگنا منافع ہوا۔ اب انھوں نے آپؐ سے نکاح کی خواہش کی، جسے حضور ﷺ نے منظور فرما لیا۔ نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال اور حضورؐ کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ حضرت خدیجہؓ مزید پچیس سال تک آپؐ کی رفیقۂ حیات رہیں۔ اس عرصے میں حضورؐ کے دل میں کبھی بھی دوسری شادی کرنے کا خیال نہیں آیا۔

جب رسول اللہ ﷺ چالیس سال کی عمر میں شرف نبوت سے سرفراز ہوئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لانے والی پہلی فرد تھیں۔ اب آپؓ نے اپنے محبوب شوہر کی غم گساری اور ہمت افزائی ہی نہیں کی بلکہ اللہ کے دین کی راہ میں اپنی پوری دولت بھی صرف کر دی۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ امت مسلمہ آپؓ کے اس عظیم مالی احسان سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ اپنے مال ہی نہیں بلکہ اثرات کی وجہ سے بھی آپؓ آخر عمر تک رسول ﷺ کی پشتیبان رہیں۔ ۹ نبوی میں جب یکے بعد دیگرے حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ کو اس کا بے انتہا صدمہ ہوا۔

آپؓ کے شرف اور فضیلت کے لیے یہی بات کافی تھی کہ آپؓ کو خانۂ کعبہ میں رسول اللہ ﷺ کی امامت میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ لیکن آپؓ کے فضائل اور مناقب بے شمار ہیں۔ آپ نے حضورؐ کو نبوت حاصل ہونے سے پہلے ہی بت پرستی ترک کردی تھی۔ حضرت ابراہیم کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی تمام اولادیں آپؓ ہی کے بطن سے ہوئیں۔ مال دار ہونے کے باوجود آپؓ حضور ﷺ کی خدمت کرنا باعث عزت وسعادت سمجھتی تھیں۔ تبلیغ اسلام کی مساعی میں ابن ہشام کی تصریح کے مطابق آپؓ رسول اللہ ﷺ کی مشیر کار تھیں۔ آپ کو جنت کی بشارت حاصل ہے۔ آپ سب سے پہلے ایمان لانے والی خاتون ہیں۔ حدیث میں آپ کو افضل النساء کہا گیا ہے۔ آپؓ کو اللہ نے اور جبریل علیہ السلام نے اپنا سلام بھیجا ہے۔ صحیحین کے مطابق دنیا میں افضل ترین عورتیں مریمؑ اور خدیجہؓ ہیں۔ آپؓ کو جنت میں موتی کا محل ملنے کی بشارت حاصل ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا امت پر، جو احسان ہے اس کے بار سے وہ کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتی، کیوں کہ آپ کی جانی و مالی تائید وحمایت اللہ کے رسولؐ کو حاصل نہ ہوتی تو آپ بہ فراغت دین کا کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔

(۶) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

عائشہ نام، ام المؤمنین خطاب، ام عبد اللہ کنیت، صدیقہ لقب اور حمیرا لقب ہے۔ حضور ﷺ نے بنت الصدیق کے نام سے بھی خطاب فرمایا ہے۔ آپؓ کاشانۂ نبوت کی سب سے چہیتی حرم تھیں۔ آپؓ کے بارے میں بجا طور سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتیں تو پورا دین امت کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آپؓ نبوت محمدیؐ کے پانچویں سال پیدا ہوئیں۔ نبوت کے دسویں سال جب کہ آپ کا سن چھ سال کا تھا رسول اللہ ﷺ سے نکاح ہوا اور شوال ۱ھ میں نو سال کی عمر میں مدینہ میں رخصتی ہوئی۔ ۱۱ر ربیع الاول ۱۱ھ میں اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں۔ ۱۷ر رمضان ۵۸ھ مطابق ۱۳ر جون ۶۷۸ء کی شب میں جب کہ آپؓ کی عمر سڑسٹھ سال تھی بعد نماز وتر وفات ہوئی۔ حضرت عائشہؓ وہ برگزیدہ خاتون ہیں، جن کے کانوں میں کبھی شرک وکفر کی آواز نہیں گئی۔ آپؓ بچپن ہی سے بہت ذہین وفطین تھیں۔ حضور اکرم ﷺ کی روزانہ آمد کی وجہ سے کاشانۂ ابوبکر میں وحی کی آواز گونجتی رہتی تھی، جو آپؓ کے حافظے پر نقش ہوتی رہتی تھی۔ ہجرت نبویؐ کی جزئیات آپؓ

ہی کے توسط سے امت تک پہنچی ہیں۔ آپ کا نکاح اور پھر رخصتی، جس سادگی سے انجام پذیر ہوئی اس میں مومنوں کے لیے اچھا نمونہ ہے۔

بچپن سے لے کر بیوگی تک کا پورا زمانہ آپؓ نے حضورؐ کے زیر تربیت بسر کیا۔ دراصل یہ نکاح اللہ تبارک وتعالیٰ کے اشارے پر ہوا تھا کیوں کہ حضور ﷺ کو خواب میں حریر کے کپڑے پر حضرت عائشہؓ کی تصویر دکھائی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ یہ آپؐ کی بیوی ہیں۔ اس نکاح کی غایت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی خانگی زندگی تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے۔ چوں کہ کاشانۂ اہل بیت دینی علوم کی یونی ورسٹی بھی تھا اس لیے اپنی جودت طبع کی وجہ سے حضرت عائشہؓ صرف عائلی ہی نہیں بلکہ تمام دینی ودنیوی علوم کی جامع بن گئیں۔

آپؓ کی پوری زندگی سوکنوں کے ساتھ گزری۔ امہات المؤمنین میں کبھی کبھی چشمک بھی ہوجایا کرتی تھی لیکن معاملہ صحبت نبویؐ کے شرف کا تھا اس لیے تلخی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ چوں کہ واحد کنواری بیوی اور سب سے کم سن تھیں اس لیے آپ کے ناز کے انداز خصوصی نوعیت کے تھے لیکن آپؓ کی ادا کا یہ انداز رسول اکرمؐ کی خصوصی التفات اور لطف ازدواج کی بنا پر تھی۔ حجۃ الوداع کے موقعے پر ناپاکی کی وجہ سے جب عمرہ نہ کرسکیں تو آپؓ کو بے حد صدمہ تھا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بھائی عبدالرحمٰنؓ کو ساتھ بھیجا کہ تنعیم جاکر خود بھی احرام باندھ کر آئیں اور دونوں بھائی بہن عمرہ کرلیں۔ آفاقیوں (بیرونِ مکہ کے حاجیوں) کے لیے تنعیم سے عمرہ کرنے کا جواز حضرت عائشہؓ کی ذات بابرکات کی وجہ سے حاصل ہوا۔ یہی ایک سہولت نہیں، جوامت کو ان کی وجہ سے حاصل ہوئی، تیمّم کی سہولت کا سبب بھی آپؓ ہی ہوئی ہیں۔

فہم قرآن میں آپ ممتاز تھیں۔ بہت سی آیتوں کا نزول آپ کے کاشانۂ مبارک میں ہوا ہے اس لیے ان کے شان نزول سے بھی آپ واقف تھیں۔ صحابۂ کرام مسائل پوچھنے آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ بعض صحابہ کی مروی روایات پر آپ آیات قرآنی کی روشنی میں نقد بھی کرتی تھیں۔ آپ کو انساب کا علم بھی حاصل تھا، جو آپ نے اپنے والد حضرت ابوبکرؓ سے سیکھا ہوگا، جو اس علم کے ماہر تھے۔ آپ نے طب بھی سیکھی تھی، جس سے مرض الموت میں رسول اللہ ﷺ کا علاج کیا تھا۔ واقعۂ ایلاء میں آپ نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھا کہ مہینہ تو تیس دن کا ہوتا ہے، آپؐ نے انتیس دن ہی میں کیوں علٰیحدگی کو تج دیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا بھی

ہوتا ہے۔ اس حدیث سے مہینہ کے دنوں کی تعداد کا تعین ہوتا ہے، جس کی ضرورت علم الفقہ میں پڑتی ہے۔ جب آیت تخییر نازل ہوئی، جس میں ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا تھا کہ عیش دنیوی یا صحبت نبویؐ میں سے، جسے چاہیں اختیار کرلیں تو آپؓ نے فوراً رسول اللہ ﷺ کو پسند کرلیا۔

آپؓ کے بے مثل جذبۂ ایثار کا ثبوت حضرت عمرؓ کو حجرۂ مبارک میں مدفون ہونے کی اجازت دینا ہے۔ غیرت کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد آپؓ نے اس مبارک حجرے کا قیام ترک کردیا۔ آپؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی حجرے میں دفن ہونے کی اجازت دی تھی لیکن باغیوں نے انھیں دفن نہیں ہونے دیا۔

زندگی میں آپؓ ایک سب سے بڑی آزمائش سے دوچار اور ایک سب سے بڑی غلطی کی مرتکب ہوئیں۔ آپؓ کی آزمائش واقعۂ افک (تہمت طرازی) سے ہوئی، لیکن یہ تہمت بھی آپ کی فضیلت کا ایک ذریعہ بن گئی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود آپ کی براءت میں سورۂ نور کی آیتیں نازل فرمائیں۔ آپ کی سب سے بڑی غلطی قصاص عثمانؓ کے لیے حضرت علیؓ کے خلاف خروج تھا، لیکن مقام حوآب پر جب کتے بھونکنے لگے تو رسول اللہؐ کی حدیث یاد آگئی اور آپ فوراً واپس ہوگئیں۔ لیکن اس غلطی کا انھیں زندگی بھر افسوس اور قلق رہا اور وہ ہمیشہ استغفار کرتی رہیں۔ مرض الموت میں وصیت کرگئیں کہ انھیں حجرۂ نبویؐ میں دفن نہ کیا جائے کیوں کہ ان سے ایک جرم سرزد ہوا ہے۔ آپؓ کی وفات حضرت امیر معاویہؓ کے عہد آخر میں ہوئی۔

آپؓ کے فضائل بے شمار ہیں۔ آپ کثیر الروایات تھیں۔ آپ کی مرویات کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہے۔ ان میں سے ۱۷۴ حدیثیں صحیحین یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں، ۵۴ حدیثیں صرف بخاری میں، ۶۷ حدیثیں صرف مسلم میں اور بقیہ ۲۰۱۷ حدیثیں دیگر سنن معتبرہ میں ہیں۔ آپ کے فضائل میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح سے پہلے ہی آپ کی شبیہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دکھلادی تھی۔ آپ حضورؐ کی سب سے چہیتی بیوی تھیں۔ بہ فرمان رسولؐ آپ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے، جیسی ثرید کی تمام کھانوں پر۔ آپ حضورؐ کی آخرت میں بھی رفیقہ ہوں گی۔ آپ کو صدیقہ کا خطاب ملا تھا۔ اصحاب رسولؐ آپ سے فرائض (وراثت) کے سوالات پوچھا کرتے تھے۔ آپ نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔ آپ کے بستر

پر وحی آتی تھی۔ آپؓ کو جبریلؑ نے تعلیم دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات آپ کے کندھوں (بازوؤں) کے درمیان ہوئی تھی۔ آپ ہی کا حجرۂ مبارک رسول اللہ ﷺ کا مدفن بنا۔

(۷) حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ

طلحہ نام، ابومحمد کنیت اور الخیر لقب، والد کا نام عبید اللہ اور والدہ کا نام صعبہ تھا۔ آپؓ کا نسب چھٹی یا ساتویں پشت میں رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کی والدہ نے طویل عمر پائی اور اسلام کے شرف سے فیض یاب ہوئیں۔ حضرت طلحہؓ ہجرت نبوی سے چوبیس پچیس سال قبل پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے تجارتی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں حضرت ابوبکرؓ کی وساطت سے دربار رسالت میں حاضر ہوکر خلعت ایمان سے مشرف ہوئے۔ ایمان لانے کے بعد آپؓ کو اپنے بھائی کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ مکہ میں آں حضرتؐ نے آپؓ کی مواخات حضرت زبیر بن عوامؓ سے کرادی تھی۔ سفر ہجرت میں آپؓ کی ملاقات آں حضورؐ سے اس وقت ہوئی جب یہ خود ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے واپس آرہے تھے۔ مکہ پہنچنے کے بعد آپؓ نے بھی مدینہ کو ہجرت کی۔ آں حضور ﷺ نے مدینہ میں آپ کی مواخات حضرت اُبی ابن کعب انصاریؓ سے کرادی تھی۔

۲ھ میں جب غزوۂ بدر واقع ہوا تو آپؓ غالباً کسی سفارت پر شام میں تھے، اسی لیے حضور ﷺ نے آپ کو غنیمت میں سے حصہ عطا فرمایا تھا۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کے لشکر نے افراتفری میں رسول اللہ ﷺ کو تنہا چھوڑ دیا تھا، حضرت طلحہؓ ان دس بارہ جاں نثاروں میں تھے، جنھوں نے خود کو رسول ﷺ کی ڈھال بنالیا تھا۔ اس میں آپؓ کی انگلیاں کٹ گئی تھیں اور جسم پر ستر زخم گنے گئے تھے۔ غزوۂ حنین کی بھگدڑ میں بھی آپؓ نے اسی جاں سپاری کا اعادہ کیا تھا۔ غزوۂ تبوک میں آپؓ نے جیش العسرۃ کی مدد کے لیے ایک خطیر رقم پیش کی اور ''فیاض'' کے خطاب سے فیض یاب ہوئے۔ حجۃ الوداع میں آپؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے صدمۂ جاں کاہ کے وقت آپؓ ایک گوشہ میں گریہ کناں تھے اس لیے انتخاب خلافت کے موقعے پر سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود نہیں تھے۔ حضرت ابوبکرؓ سے بیعت بھی اسی لیے آپ نے بعد میں کی۔ پھر خلیفۂ رسولؐ کے زمانہ میں ان کے دست و بازو بن کر رہے۔ آپؓ حضرت عمرؓ کے مزاج کی سختی کی وجہ سے ان کے خلیفہ بنائے جانے کی وصیت کے حق میں نہیں تھے لیکن بعد میں

ان کی رائے بدل گئی اور اختلافی مسائل میں انھوں نے ہمیشہ حضرت عمرؓ کا ساتھ دیا۔ ممالک کی فتوحات کے بعد ملکیت زمین کے مسئلے میں بھی آپؓ نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی تائید کی کہ ان زمینوں کی حیثیت فے کی ہے اور فاتحین میں ان کی تقسیم درست نہیں ہے۔ آپ نے ایرانیوں کے خلاف جنگوں کے لیے اپنے کو ہمیشہ تیار رکھا۔

آپؓ ان چھ افراد میں سے ہیں، جن کو حضرت عمرؓ نے اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ آپؓ اپنی بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ آخر عہد عثمانی میں جب فتنہ وشورش کا بازار گرم ہوا تو آپ کے ہی مشورہ سے حضرت عثمانؓ نے تحقیقی وفود روانہ کیے۔ جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کر رکھا تھا تو آپؓ نے بھی حضرت علیؓ کی طرح اپنے صاحب زادہ محمد کو ان کی حفاظت پر مامور کیا تھا اور انھوں نے مفسدین سے جنگ بھی کی تھی۔

حضرت علیؓ کی خلافت جس انداز سے قائم ہوئی آپ اس سے متفق نہ تھے لیکن انتشار اور فتنہ کے اندیشہ سے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے قتل ناحق کی وجہ سے جو شورش پیدا ہوئی، اس کی وجہ سے حضرت زبیرؓ کے ساتھ مکہ چلے آئے اور حضرت عائشہؓ کی رہ نمائی میں قصاص عثمان کے لیے مکہ سے خروج کیا۔ شورش پسند لوگ مقام ذی قار پر جمع ہو کر جب بصرہ کی طرف بڑھے تو حضرت عائشہؓ کی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چوں کہ تمام ہی اجلہ صحابہ قتال بین المسلمین سے خوش نہیں تھے اس لیے صلح کی سلسلہ جنبانی ہوئی۔ یہاں مروان نامی ایک مفسد ۔نے ایک تیر چلایا، جو آپؓ کے لیے پیغام قضا ثابت ہوا اور آپؓ نے چونسٹھ سال کی عمر میں شہادت حاصل کی۔ آپؓ میدان جنگ ہی میں مدفون ہوئے۔ لیکن یہ زمین ہمیشہ غرق آب رہا کرتی تھی اس لیے ایک خواب سے اشارہ پا کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوبکرہؓ کا مکان دس ہزار درہم میں خرید کر انھیں وہاں دفن کر دیا۔ بہ وقت دفن ثانی ان کا جسم معطر اور تر و تازہ تھا۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ آپؓ کے بارے میں بشارت ہے کہ آپؓ جنت میں رسول اللہ ﷺ کے پڑوسی ہوں گے۔ قرآن کی آیت: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ (الاحزاب:۲۳) ''مومنوں میں (ایسے) لوگ بھی ہیں، جنھوں نے جو عہد اللہ سے کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔'' آپؓ کی مدح میں نازل ہوئی۔ آپؓ اقلیم سخا کے بادشاہ تھے۔

آپؓ نے غزوہ ذی القرد میں بیسان مالح کا چشمہ خرید کر وقف کر دیا تھا۔ مہمان نوازی اور دوستوں کی خدمت گزاری میں بے مثل تھے۔ آپؓ نے متعدد شادیاں کیں اور ہر ایک سے اللہ نے اولاد دی تھی۔

(۸) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ

حواری رسول، یکے از عشرۂ مبشرہ، ابوعبداللہ زبیر بن عوامؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ حضورؐ کی پھوپھی تھیں۔ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے شوہر ہونے کی وجہ سے آپؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف تھے۔ ہجرت نبویؐ سے اٹھائیس سال قبل پیدا ہوئے۔ والدہ نے بچپن ہی میں مشقت اور دلیری کی خو ڈال دی تھی، جو آخر عمر تک برقرار رہی۔

سولہ برس کی عمر میں دولت ایمان سے سرفراز ہوئے۔ اس طرح آپؓ کا شمار اول المؤمنین میں ہوتا ہے۔ قبول اسلام کے بعد ان کا چچا انھیں چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں ڈالتا یہاں تک کہ دم گھٹنے لگتا تھا لیکن آپؓ یہی کہتے تھے کہ اسلام کے بعد اب کفر نہیں۔ پہلے حبشہ کو ہجرت کی پھر مدینہ کو وطن بنایا۔ آں حضرتؐ نے مکہ میں حضرت طلحہؓ سے اور مدینہ میں حضرت سلمہ بن سلامہ انصاریؓ سے مواخات کرائی تھی۔ حضورؐ کی حفاظت کی خاطر سب سے پہلے آپؓ نے اپنی تلوار کو بے نیام کیا تھا۔

جنگ بدر میں شجاعت کے انتہائی جوہر دکھائے اور بڑے بڑے مشرک پہلوانوں کو ڈھیر کر دیا۔ اس جنگ میں آپؓ کا عمامہ زرد رنگ کا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتوں کے عماموں کا بھی یہی رنگ ہے۔ جنگ احد میں جب لشکر اسلام پراگندہ ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے والوں میں اس حواری رسول کا بھی نام تھا۔ غزوۂ خندق میں بنوقریظہ کی خبر لانے کے لیے ایک ہوشیار جاسوس کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپؓ نے اپنے کو پیش کیا، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فداك ابی و امی (میرے ماں، باپ آپ پر فدا ہوں) جیسا قابل رشک فقرہ آپؓ کے حق میں ارشاد فرمایا۔ غزوۂ خیبر میں آپ نے رئیس خیبر مرحب کے بھائی یاسر کو قتل کیا۔ فتح مکہ کے موقعے پر جب حاطب بن ابی بلتعہؓ نے مکہ کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ایک عورت کو خط دیا تو اس کی تلاشی لینے والوں میں حضرت زبیرؓ بھی تھے۔ فتح مکہ کے موقعے پر

جس فوجی دستے میں حضورؐ موجود تھے اس دستے کے علم بردار زبیرؓ تھے۔ اس غزوہ میں حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو غنیمت کا دوہرا حصہ ملا تھا۔ زبیرؓ، غزوہ حنین، طائف اور تبوک کی فوج کشی میں شریک رہے اور داد شجاعت دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت پر آپ کو کچھ تردد تھا، لیکن بعد میں آپؓ نے بیعت کر لی۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں جنگ یرموک میں شرکت کی تو رومیوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ فسطاط اور اسکندریہ (مصر) کی فتح میں بھی حضرت زبیرؓ کو ایک دستہ کی سالاری عطا ہوئی تھی۔ آپؓ نے یہاں مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا لیکن حضرت عمرؓ، ان زمینوں کو ''فے'' قرار دے چکے تھے اس لیے تمام مفتوحہ زمینوں کا فیصلہ اسی پر رہا۔ خلیفہ ثالث کے عہد میں آپؓ نے نہایت خاموشی کی زندگی بسر کی لیکن خلیفۃ المسلمین کی محصوری کے وقت اپنے فرزند حضرت عبداللہؓ کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کر دیا تھا۔ خلیفۂ ثالث کے قتل کے بعد جب باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تو رفع شر کی خاطر آپؓ نے بیعت کر لی لیکن بعد میں حضرت طلحہؓ کے ساتھ مکہ چلے گئے اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ قتل عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جنگ جمل میں جب حضرت علیؓ نے آپؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی یاد دلائی کہ ایک دن تم علی سے ناحق لڑو گے تو آپؓ کو تنبہ ہوا اور جنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہاں سے واپسی میں جرموز نامی ایک بدبخت نے آپؓ کو بحالت نماز شہید کر ڈالا۔ آپؓ نے چونسٹھ سال کی عمر پائی اور وادی السباع میں سپرد خاک ہوئے۔

آپؓ کا دامن اخلاقی زر و جواہر سے مالا مال تھا۔ تقویٰ، پارسائی، حق پسندی، بے نیازی، سخاوت، ایثار، رقت قلب اور خشیت الٰہی میں ممتاز تھے۔ مزاج میں استقلال تھا۔ مساوات کی صفت سے متصف تھے۔ آپؓ کو بہت سے صحابہ نے وصی بنایا تھا۔ آپؓ نہایت دیانت داری کے ساتھ ان کے مال و متاع کی حفاظت کرتے اور ان کے اہل و عیال پر صرف کرتے تھے۔

آپؓ اپنے اہل و عیال سے بہت محبت کرتے تھے۔ کثیر العیال تھے۔ آپؓ کے فرزندوں میں حضرت عبداللہ بہت مشہور ہیں، جن کا شمار عبادلۂ اربعہ میں ہوتا ہے۔ یہ حضرت

اسماءؓ کے بطن سے تھے۔آپؓ عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔مزید درجۂ فضیلت یہ ہے کہ شہادت نبویؐ کے بہ موجب جنت میں آپؓ حضورؐ کے پڑوسی ہوں گے۔

(۹) حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ

عامر نام، ابوعبیدہ کنیت، امین الامت خطاب، والد کا نام عبداللہ لیکن دادا ابن الجراح کی طرف منسوب، سلسلہ نسب پانچویں پشت میں رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے۔حضرت ابوبکرؓ کی دعوت پر دولت اسلام سے فیض یاب ہوئے۔آپؓ اول الاسلام ہیں، آپؓ کی والدہ بھی ایمان لے آئی تھیں۔قریش کے ظلم وستم سے مجبور ہو کر حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک رہے اور جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو آپؓ نے تیسری ہجرت کی سعادت بھی حاصل کی۔ اللہ کے رسولؐ نے مدینہ میں حضرت سعد بن معاذؓ سے آپؓ کی مواخات کرادی تھی۔

جوش ایمان میں جنگ بدر میں آپؓ نے اپنے والد کو اپنے ہاتھوں قتل کیا تھا۔اسی پر یہ آیت نازل ہوئی تھی:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَآءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ (المجادلہ:۲۲)

’’تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔‘‘

غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک میں خود کی دو کڑیاں چبھ گئی تھیں، ان کو نکالنے میں آپؓ کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔مقام ذی القصہ پر قبیلہ ثعلبہ اور انمار کے ڈاکوؤں پر چالیس آدمیوں کے ساتھ حملہ کیا اور ایک شخص کو گرفتار کرلیا۔حدیبیہ کے صلح نامہ پر آپؓ کی شہادت بھی ثبت تھی۔آپؓ نے خیبر کی فوج کشی میں حصہ لیا اور سریہ ذات السلاسل میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی مدد کے لیے ایک فوج کے ساتھ روانہ کیے گئے۔۸ھ میں قریشی قافلوں کی نقل و حرکت کی جاسوسی کے لیے ساحل کی شاہ راہ پر متعین کیے گئے۔یہیں پر غلہ ختم ہوجانے پر اللہ نے ایک بڑی مچھلی کے ذریعے مسلمانوں کی غذا کا انتظام فرمایا تھا۔

نجران کے وفد نے جب ایک معلم اور قاضی بھیجنے کی فرمائش کی تو آں حضور ﷺ نے آپ ؓ کو مامور فرمایا اور اسی موقعے پر آپ ؓ کو ''امین الامت'' کا خطاب دیا۔ آپ ؓ کو بحرین سے جزیہ کی رقم لانے پر بھی مامور کیا گیا تھا اور آپ ؓ کی کام یاب واپسی کی اللہ نے خوش خبری دی تھی۔ آپ ؓ حجۃ الوداع میں حضرت ﷺ کے ہم رکاب تھے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر ؓ نے عمر ؓ اور ابوعبیدہ ؓ ہی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کرلو، لیکن ان دونوں نے بالاتفاق حضرت ابوبکر ؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے امت کے ایک عظیم فتنے کو فرو کر دیا۔

حضرت ابوبکر ؓ نے معرکۂ شام میں آپ ؓ کو حمص کی طرف روانہ فرمایا تھا اور بقیہ تین لشکروں کے سرداروں یزید بن ابوسفیان ؓ کو دمشق، شرحبیل بن حسنہ ؓ کو اردن اور عمرو بن العاص ؓ کو فلسطین کی فتح پر مامور کیا تھا، لیکن حکم دے دیا تھا کہ فارغ ہو جانے کے بعد ابوعبیدہ ؓ کی ماتحتی میں جمع ہو جائیں۔ بعد میں جب رومی لشکر کا سیلاب امنڈ آیا تو خلیفۂ رسول ؐ نے حضرت خالد بن ولید ؓ کو جو اس وقت شام کی مہم میں مصروف تھے آپ ؓ کی اعانت کا حکم دیا۔ آپ ؓ ہی کی سپہ سالاری میں دمشق، فحل، حمص اور لاذقیہ فتح ہوئے اور آپ ؓ ہی کی قیادت میں یرموک کا تاریخی معرکہ پیش آیا، جس نے ایشیا سے رومی حکومت کا جنازہ نکال دیا۔ بیت المقدس کے بطارقہ نے آپ ؓ ہی کے توسط سے حضرت عمر ؓ سے صلح اور امان کی درخواست کی اور امیر المومنین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ رومیوں نے جب آخری کوشش کے طور پر جزیرہ اور آرمینیا والوں کو اسلامی لشکر کے خلاف کھڑا کیا تو آپ ؓ نے پھر ان کا پیچھا کیا اور مرج الدیباج تک پہنچ گئے۔

حضرت ابوعبیدہ ؓ کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمر ؓ نے خالد بن ولید ؓ کو سرداری سے معزول کر کے آپ ؓ کو سپہ سالار مقرر کیا تو جنگ یرموک میں فتح حاصل ہونے تک کسی کو اس معزولی اور نئی تقرری کی خبر تک نہیں ہونے دی اور جب بعد میں حضرت خالد ؓ کو اطلاع دی تو اس پر اپنی طرف سے بہت معذرت کا اظہار کیا۔ کیوں کہ آپ ؓ رسول اللہ ﷺ کی زبانی سن چکے تھے کہ خالد ؓ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں (اسی لیے انھیں سیف اللہ کا خطاب ملا تھا)۔

آپ ؓ تقدیر کے زبردست قائل تھے، چناں چہ ۱۸ھ میں جب عمواص میں طاعون کی وبا

پھیلی تو خلیفہ کا حکم ہونے کے باوجود آپؓ وہاں سے نہیں ہٹے اور وہیں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

حضرت ابوعبیدہؓ کے صحیفۂ اخلاق میں خدا ترسی، اتباع سنت، تقویٰ، زہد، تواضع، مساوات اور ترحم کے ابواب نہایت روشن ہیں۔ خوف خدا درجۂ کمال کا تھا۔ آپؓ نے بدر کے معرکۂ کفر وایمان میں قرابت کا خیال کیے بغیر والد کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا۔ کئی مواقع پر اختلاف کے باوجود فتنے کے اندیشہ سے دوسروں کی اطاعت کی۔ شام میں ان کی شفقت اور رعایا پروری نے عیسائیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ آپؓ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو ''امین الامت'' کا خطاب اور زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی تھی۔

(۱۰) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

عبدالرحمٰن نام، ابومحمد کنیت، والد کا نام عوف اور والدہ کا نام شفا تھا۔ زہرہ بن کلاب کی اولاد میں سے تھے۔ اصلی نام عبد عمرو تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عبدالرحمٰن نام رکھا۔ واقعۂ فیل کے دسویں سال پیدا ہوئے۔ اول الاسلام ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رہ نمائی میں ہدایت یاب ہوئے۔ فطری عفت وسلامت روی کے باعث قبول اسلام سے پہلے ہی شراب نوشی ترک کر چکے تھے۔ آپ مہاجرین حبشہ میں سے ہیں پھر مدینہ ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں آپؓ کی مواخات سعد ابن الربیع انصاری سے ہوئی۔ انھوں نے اپنے مال اور عیال کا نصف انھیں دینا چاہا تو فطری غیرت نے گوارا نہ کیا۔ دینی بھائی نے ان کی درخواست پر انھیں بنوقینقاع کا بازار دکھلا دیا، جو جنۃ البقیع کے جنوب میں مسجد نبوی سے قریب ترین بازار تھا۔ اس بازار میں بعد میں کھجوروں کی تجارت پر آپؓ کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ پہلے ہی دن آپؓ بازار سے نفع کما کر لوٹے تھے اور جلد ہی آپؓ نے شادی بھی کر لی تھی۔ آپؓ ہی کے نکاح سے معلوم ہوا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہؓ کے نزدیک نکاح اور ولیمہ میں کس قدر سادگی مطلوب ہے، نیز یہ کہ نکاح کا کھانا صرف ولیمہ ہے۔

غزوۂ بدر میں دو چھوٹے بچوں کے لیے ابوجہل کی شناخت انھوں نے ہی کی تھی اور انھوں نے فوراً لپک کر اسے قتل کر دیا تھا۔ غزوۂ احد میں بیس سے زیادہ زخم انھیں لگے تھے۔ دومۃ الجندل کی مہم میں رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے روانہ کیا تھا۔

اس مہم سے آپؓ کامراں واپس آئے تھے۔ پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا تھا اور قبیلے کے سردار کی لڑکی آپ کے عقد میں تھی۔

فتح مکہ کے بعد جب حضرت خالید بن ولیدؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خواہش کے برخلاف بنو جذیمہ میں قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کردیا تو اگرچہ اس قبیلے سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی عداوت تھی لیکن آپؓ نے حضرت خالدؓ سے ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ فتح مکہ کے بعد آپؓ تمام جنگی مہمات میں پیش پیش رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے والوں میں آپؓ کا نمبر تیسرا تھا۔

آپؓ خلیفۂ رسولؐ حضرت صدیق اکبرؓ کی مجلس شوریٰ کے مخلص اور صائب الرائے رکن تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی نامزدگی کے لیے سب سے پہلے آپؓ ہی سے رائے لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جو مجلس شوریٰ قائم کی اس کے بھی آپؓ پرجوش رکن رہے۔ عراق میں فوجوں کی کمان کرنے کے لیے جب بعض صحابہؓ نے خلیفۃ المسلمین پر دباؤ ڈالا تو حضرت عبدالرحمٰن ہی نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور آپؓ ہی کے مشورہ سے حضرت سعد بن وقاصؓ کو امیر لشکر مقرر کیا گیا تھا۔ معرکۂ نہاوند میں بھی دوسرے صحابہؓ کے مشوروں کے برخلاف آپؓ نے حضرت عمرؓ کے جانے کی مخالفت کی لیکن رومیوں کے مقابلے میں جب مسلمان حمص چھوڑ کر پیچھے ہٹ آئے تو آپؓ تڑپ اٹھے اور امیرالمؤمنین سے کہا کہ ''اٹھ اور مجھ کو ساتھ لے کر چل۔''

جب حضرت عمرؓ پر نماز فجر میں قاتلانہ حملہ ہوا تو انھوں نے حضرت عبدالرحمٰنؓ ہی کو امامت کے لیے آگے بڑھادیا تھا۔ انھوں نے نماز مختصر کردی تھی اور حضرت عمرؓ کو گھر لائے تھے۔

آپؓ ان چھ آدمیوں میں سے ہیں، جنھیں حضرت عمرؓ نے خلافت کے Panel کے طور پر مقرر کیا تھا لیکن آپ از خود اس حق سے دست بردار ہوگئے تھے۔ پھر جب معاملہ آپ کے اوپر ڈال دیا گیا تو آپؓ نے اللہ، رسولؐ اور شیخین کی سنت پر عمل کرنے کا عہد لے کر حضرت عثمانؓ کے حق میں فیصلہ دیا اور سب سے پہلے خود بیعت کی۔

عہد عثمانی میں آپؓ نے خاموشی کی زندگی بسر کی اور ۳۱ھ میں پچھتر سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ حضرت علیؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے آپؓ کے لیے کلمات خیر کہے اور حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آپؓ کی ذات سے خلفائے اسلام نے زبردست فائدہ اٹھایا۔ آپؓ کے علم وفضل اور کمال کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔ آپؓ ہی نے اس حدیث کی تصدیق کی کہ ''انبیاء کا ترکہ نہیں ہے۔'' حضرت عمرؓ نے آپؓ ہی کے مشورہ سے ایران کی رعایا کو ''ذمی'' قرار دیا تھا۔ یہ حدیث بھی آپؓ کی بیان کی ہوئی ہے کہ ''جہاں طاعون ہو وہاں نہ جاؤ اور اگر تم پہلے سے طاعون زدہ علاقہ میں ہو تو وہاں سے نہ ہٹو۔'' حضرت عمرؓ آپ کی اصابت رائے کے قائل تھے۔ چناں چہ آپ نے فرمایا تھا کہ ''اگر انتخاب میں مخالفت پیدا ہو جائے تو جس طرف عبدالرحمٰن ہوں ان کا ساتھ دینا۔''

آپؓ خوف خدا، حب رسولؐ، دیانت داری، صدق، عفاف اور انفاق فی سبیل اللہ میں بے مثل تھے۔ استغناء کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ پورا تجارتی قافلہ، جس میں سات سو اونٹوں پر غلہ لدا ہوا تھا مع اونٹوں اور کجاووں کے راہ خدا میں وقف کر دیا۔

جب سورۂ براءۃ نازل ہوئی اور صحابۂ کرام کو صدقہ وخیرات کی ترغیب دی گئی تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اپنا نصف مال یعنی چار ہزار درہم پیش کیا پھر دو دفعہ چالیس چالیس ہزار وقف کیے۔ اسی طرح جہاد کے لیے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ حاضر کیے۔ ایک دفعہ اپنی زمین چالیس ہزار دینار میں عثمان غنیؓ کے ہاتھ فروخت کی اور پوری رقم راہ خدا میں لٹا دی۔ وفات کے وقت پچاس ہزار دینار اور ایک ہزار گھوڑے راہ خدا میں وقف کیے، نیز بدر کی جنگ میں، جو صحابہؓ شریک تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے چار چار سو دینار کی وصیت کی۔ امہات المؤمنین کے لیے بھی ایک باغ کی وصیت کی، جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ مختلف مواقع پر آپؓ ان کی ایسی ہی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک جائداد پیش کی، جو چالیس ہزار دینار میں فروخت ہوئی۔ حضرت عائشہؓ ان کے لیے اور ان کے صاحب زادہ ابوسلمہؓ کے لیے دعا کیا کرتی تھیں۔ آپؓ نے متعدد شادیاں کیں اور صاحب اولاد کثیرہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی تھی۔

(۱۱) حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ

سعد نام، ابواسحاق کنیت، والد کا نام مالک بہ کنیت ابووقاص، والدہ کا نام حمنہ تھا۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے ماموں لگتے تھے۔ آپؓ اول الاسلام ہیں۔ صرف انیس سال کی عمر میں

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے توسط سے جاں نثاران اسلام میں داخل ہوگئے۔ قبول اسلام کے بعد گھریلو آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؓ کو اگرچہ اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی لیکن آپؓ نے صاف کہہ دیا کہ وہ والدہ کی خاطر اسلام سے دست کش نہیں ہوسکتے۔ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ ایک گھاٹی میں مصروف عبادت تھے اور ایک کافر نے آپؓ پر طنز کیا تو حضرت سعدؓ نے اونٹ کی ایک ہڈی سے اس کے اوپر ایسی ضرب لگائی کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ مدینہ میں طلایہ گردی کے دوران پہلا تیر بھی چلانے کا شرف آپؓ ہی کو حاصل ہے۔

ہجرت کے بعد مدینہ میں اپنے بھائی عتبہ بن ابی وقاص کے مکان میں فروکش ہوئے۔ یہاں آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ بار بار آپؓ کو طلایہ گردی (Patrolling) کے لیے مدینہ سے باہر بھیجتے رہے۔ معرکۂ بدر میں سعید بن عاص کو قتل کرکے اس کی مشہور تلوار ذوالکتیفہ کے حق دار ہوئے تھے۔ غزوۂ احد میں جب مسلم فوج کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اس وقت آپؓ برابر حضور ﷺ کی جاں نثاری میں حاضر رہے۔ حضور ﷺ آپ کو تیر دیتے رہے اور آپؓ برابر تیر چلاتے رہے۔ اسی موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے یہ جملہ فرمایا تھا یا سعد! ارم، فداك ابی و امی (اے سعد! تیر چلاتے رہو، میرے ماں باپ تم پر قربان)۔ حضرت علیؓ کے بہ موجب ایسا جاں فزا کلمہ رسول اللہ ﷺ نے کسی اور کے لیے نہیں استعمال فرمایا۔ اس جنگ میں حضرت سعدؓ نے اپنے تیروں سے کئی کفار کو واصل بہ جہنم کیا تھا۔ غزوۂ احد کے بعد آپؓ تمام غزوات میں پیش پیش رہے۔ حجۃ الوداع کے موقعے پر بیمار پڑ گئے لیکن آپؓ کو مدینہ سے باہر مرنا پسند نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے رسول اللہ ﷺ کی دعا سے شفایاب ہوگئے۔ آپؓ نے اس وقت اپنی ایک تہائی دولت راہ خدا میں نذر کردی تھی۔

حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں آپؓ دونوں خلفاء کا ساتھ دیتے رہے۔ عراق کی فوج کشی میں حضرت عمرؓ نے آپؓ کو فوج کا سپہ سالار بنایا تھا۔ قادسیہ کی تاریخ ساز جنگ آپؓ ہی کمان میں لڑی گئی، جس نے عراق عرب پر اسلام کا علم نصب کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بابل، کوثی، بہرۂ شیر اور مدائن فتح ہوگئے۔ اس کے بعد تو فتوحات کا سیلاب آگیا اور اسلامی فوجوں نے جلولا اور تکریت میں اپنے قدم جمالیے۔

آپؓ نے حضرت عمرؓ کی ہدایت پر کوفہ کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے شہر کے مرکز میں

ایک مسجد، بیت المال اور امیر کی فرودگاہ تعمیر کی۔ مصر پر فوج کشی کے وقت جب جزیرہ سے ایک فوج رومیوں کی مدد کے لیے روانہ ہوئی تو آپؓ نے بڑھ کر اسے آگے جانے سے روک دیا۔ عراق عجم کی جنگوں کے لیے دربار خلافت کے ایماء پر آپ نے حضرت نعمان بن مقرنؓ کو امیر لشکر مقرر کیا، جنھوں نے اصفہان، نہاوند اور خوزستان وخراسان تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

کوفہ کے قیام کے دوران لوگوں نے دربار خلافت میں دوبار آپؓ کی شکایتیں کیں تو حضرت عمرؓ نے انھیں مدینہ واپس بلالیا، لیکن یہ بات صاف کردی کہ انھیں کسی کم زوری یا خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا گیا ہے۔ چناں چہ جانشین عمرؓ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں پھر کوفہ کا والی مقرر کردیا۔ ۲۶ھ میں مہتمم بیت المال حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی شکایت پر پھر مدینہ واپس بلا لیے گئے۔ اس کے بعد آپؓ نے عزلت گزینی اختیار کرلی۔ الفتنۃ الکبریٰ (جنگ جمل و جنگ صفین) میں آپ نے کسی بھی فریق کا ساتھ دینے سے انکار کردیا اور ایک تاریخ ساز بات کہی کہ ''مجھے ایسی تلوار بتاؤ جو مسلم اور کافر میں امتیاز رکھے۔'' یہ بات انھوں نے اس لیے کہی کہ جنگ کے سبھی فریق یعنی حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ مسلمان تھے۔

۵۵ھ میں جب آپؓ ستر سال سے متجاوز ہو چکے تھے، مدینہ کے مضافات میں اپنی تعمیر کی ہوئی رہائش گاہ میں آپ کا انتقال ہوا۔ حسب وصیت جنگ بدر میں پہنے ہوئے کپڑوں کا کفن دیا گیا۔ جنازہ مسجد نبوی میں ازواج مطہرات کے حجروں کے سامنے لایا گیا اور انھوں نے بھی نماز جنازہ ادا کی۔ جنۃ البقیع میں مدفون ہوئے۔

آپؓ کا علمی وقار اتنا بلند تھا کہ حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ جب سعد حدیث روایت کریں تو پھر اس کے بارے میں کسی اور سے نہ پوچھو۔ آپؓ کو رسول اللہ ﷺ سے کچھ پوچھنے میں تکلف نہیں ہوتا تھا۔ خشیت الٰہی، حب رسولؐ، تقویٰ، زہد، بے نیازی اور خاکساری آپؓ کے مصحف اخلاق کے روشن ابواب ہیں۔ جرأت اور جاں نثاری کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک غزوہ سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ کو دشمنوں کا خطرہ تھا۔ آپؐ کی خواہش ہوئی کہ کاش کوئی پہرہ دیتا تو آپؐ تھوڑا آرام فرمالیتے۔ حضرت سعدؓ کے دل میں بھی یہ بات آئی اور اس خدمت کے لیے وہ از خود حاضر ہوئے اور رسول گرامیؐ کی دعاؤں سے فیض یاب ہوئے۔ غیرت ایمانی کا حال یہ تھا کہ اپنے سگے بھائی عتبہ کے خون کے پیاسے تھے کیوں کہ اس نے غزوہ احد میں حضورؐ کے روئے مبارک کو زخمی

کیا تھا۔ حضور ﷺ نے مدینہ کو حرم قرار دیا تھا اس لیے جب حضرت سعدؓ نے ایک غلام کو درخت کاٹتے ہوئے دیکھا تو اس کے اوزار چھین لیے۔

آپؓ فاتح ایران کہلاتے ہیں۔ آپؓ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپؓ یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں۔

(۱۲) حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

سعید نام، ابوالاعور کنیت، والد کا نام زید اور والدہ کا نام بعجہ تھا۔ نفیل پر حضرت عمرؓ سے اور کعب بن لوی پر آپؓ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے۔ آپ کے والد زید نے آفتاب اسلام سے پہلے ہی نور اسلام کا جلوہ دیکھ لیا تھا اور فسق و فجور اور چڑھاوے کے کھانوں اور رسوم مشرکانہ سے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ گو وہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت زندہ نہیں تھے لیکن اسی کا اثر تھا کہ ان کے فرزند سعیدؓ نے اپنی نیک بخت بیوی فاطمہؓ کے ساتھ، جو حضرت عمرؓ کی حقیقی بہن تھیں، اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر ناراض ہو کر دونوں کو بری طرح مارا پیٹا، لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ خود حضرت عمرؓ کا دل اسلام کے لیے کشادہ ہو گیا۔

آپؓ نے مہاجرین اولین کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تھی۔ مدینہ میں آپؓ کی مواخات رسول اللہ ﷺ نے حضرت رافع بن مالک انصاریؓ سے کرائی تھی۔ جنگ بدر سے پہلے ابوسفیان کے قافلے کی جب وہ شام سے واپس آ رہا تھا آپؓ اور حضرت طلحہؓ نے جاسوسی کی تھی۔ لیکن ابوسفیان نے خود ہی راستہ تبدیل کر لیا تھا۔ آپؓ اگر چہ اس مہم کی وجہ سے جنگ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے لیکن حضورؐ نے انھیں مال غنیمت میں سے مجاہد کا حصہ دلوایا تھا اور ثواب کی بشارت بھی دی تھی۔ غزوۂ بدر کے علاوہ آپ تمام جنگی مہمات میں لشکر اسلامی کے ہم رکاب رہے۔

عہد فاروقی میں حضرت ابوعبیدہؓ کے تحت ایک پیدل فوج کی افسری آپؓ کے سپرد ہوئی تھی۔ شوق جہاد کی وجہ سے آپؓ نے دمشق کی گورنری کو مسترد کر دیا تھا۔ شام کی فتح کے بعد آپؓ کی زندگی نہایت سکون اور خاموشی سے گزری۔ ۵۰ھ یا ۵۵ھ میں نواح مدینہ میں عقیق کے مقام پر اپنے مسکن میں انتقال فرمایا۔ جمعہ کا دن تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے غسل دیا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مدینہ میں مدفون ہوئے۔

حضرت سعیدؓ کا دل دنیاوی جاہ حشمت سے مستغنی تھا۔ صرف عقیق کی جائداد پر گزر

اوقات تھی۔ اہل مدینہ آپؓ کے قسم اور بد دعا کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ آپؓ کی نظروں کے سامنے بہت سے انقلابات آئے لیکن آپؓ تمام فتنوں سے کنارہ کش رہے۔ حضرت عثمانؓ کے قتل پر آپؓ نے فرمایا کہ ''اس سے اگر کوہ احد متزلزل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔'' ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی مجلس میں کسی نے حضرت علیؓ کی شان میں کچھ نازیبا کلمات کہے تو آپؓ ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ ''علیؓ ان آٹھ آدمیوں میں ہیں، جنھیں جنت کی بشارت حاصل ہے۔'' لوگوں کے اصرار پر بتلایا کہ نویں آدمی وہ خود ہیں۔ آپؓ نے کئی شادیاں کیں اور صاحب اولاد کثیرہ تھے۔

(۱۳) حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

خالد نام، ابوسلمان کنیت، سیف اللہ لقب، والد کا نام ولید اور والدہ کا نام لبابہ تھا، جو ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کی قریبی عزیز تھیں۔ آپؓ قبیلہ بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت سے یہ خاندان قبّہ (سپہ سالاری) اور آعنہ (فوجی کیمپ کا انتظام) پر مامور چلا آتا تھا۔ آپؓ زبردست جنگی قابلیت کے حامل تھے۔ غزوۂ احد میں انھیں کے تدبر سے مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی۔ صلح حدیبیہ کے موقعے پر قریش کے جاسوسی دستے کے سالار تھے۔ ہجرت نبویؐ کے چھٹے اور آٹھویں سال کے درمیان کسی وقت نعمت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ فتح مکہ کے موقعے پر انھیں کے دستے سے مزاحم ہونے کی بنا پر اہل مکہ کے چند افراد مارے گئے تھے۔ غزوہ حنین اور طائف میں آپؓ نے اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے۔ غزوۂ موتہ میں حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد لشکر اسلام کو، جس کی تعداد صرف تین ہزار تھی ایک لاکھ (یا دو لاکھ) رومیوں کے نرغے سے اس شان سے بچا کر لائے کہ مسلمانوں کے صرف بارہ آدمی مقتول ہوئے جب کہ ان کے ہاتھ سے بارہ تلواریں ٹوٹیں۔ اس موقعے پر دربار نبویؐ سے آپؓ کو ''سیف اللہ'' کا معزز خطاب ملا۔ جنگ تبوک میں دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر بن عبدالملک کو آپؓ ہی نے گرفتار کیا تھا۔ سریہ بنو جذیمہ میں زبان کے فرق کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطی سے ان کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، جس پر رسول اللہ ﷺ نے افسوس کا اظہار کیا تھا اور خوں بہا بھی ادا فرمایا تھا۔ عہد نبویؐ میں آپؓ کو یمن بھی بھیجا گیا تھا لیکن اس میں آپؓ کی حیثیت حضرت علیؓ کی فوج کے ایک امدادی دستہ کی تھی۔ آپؓ ہی نے سریہ عزیٰ میں وہاں کے صنم کدہ کو مسمار کیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں نبی کاذب طلیحہ اسدی کا قلع قمع کرنے کے بعد آپؓ نے مسیلمہ کذاب کی سرکوبی میں حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کی مدد کی۔ اس جنگ میں مسیلمہ، قاتل حمزہؓ، وحشی کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ مرتدین کا قلع قمع کرنے کے بعد آپؓ نے مانعین زکوٰۃ کی سرکوبی میں بھی حصہ لیا۔

عہد صدیقی ہی میں روم اور ایران کی جنگیں پیش آئیں۔ خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپؓ کو بحرین میں مثنّٰی بن حارثہؓ کی مدد کے لیے مامور فرمایا، جو ایرانی افواج کے ساتھ مصروف پیکار تھے۔ کاظمہ میں ایرانی حاکم ہرمز کو قتل کرنے کے بعد آپؓ مذار کی طرف بڑھے۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کے دونوں سپہ سالار مقتول ہوئے۔ اس کے بعد آپؓ نے کسکر اور الیس میں ایرانیوں کو پسپا کیا، اس کے بعد آپؓ امغیشیا اور حیرہ کی طرف بڑھے، پھر انبار اور عین التمر پہنچ جانے کے بعد دربار خلافت کے حکم پر دومۃ الجندل پہنچ گئے جہاں حضرت ابوعبیدہؓ کے لشکر کو رومیوں نے محصور کر رکھا تھا۔ وہاں کا پانسہ پلٹنے کے بعد آپؓ پھر ایرانی حدود میں واپس آئے اور فراض کے مقام پر ایرانیوں، رومیوں اور عربوں کی مشترکہ فوجوں کا مقابلہ کر کے انھیں شکست فاش دی۔ اس کے بعد آپؓ کو شام پہنچنے کا حکم ہوا۔ آپؓ ایران کی مہم کو حضرت مثنیٰ بن حارثہ کے سپرد کر کے اجنادین اور فحل کو فتح کرتے ہوئے دمشق پہنچ گئے اور دمشق اور حمص کو فتح کرتے ہوئے یرموک میں ڈیرے ڈال دیے جہاں رومیوں نے اپنی پوری قوت اکٹھا کر رکھی تھی۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ انھوں نے بوجوہ خالدؓ کو سپہ سالاری سے معزول کر کے انھیں حضرت ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں دے دیا۔ لیکن یرموک کی جنگ حضرت خالدؓ ہی کی ہدایات کے تحت لڑی گئی اور مسلمان فتح عظیم سے ہم کنار ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے پاس آپؓ کو سپہ سالاری سے معزول کرنے کے وجوہ تھے، لیکن آپؓ کی صلاحیتوں سے انھوں نے دوسرے شعبوں میں فائدہ اٹھایا۔ آپؓ کو مختلف علاقوں کی گورنری سے سرفراز کیا گیا، لیکن آپ کی طبیعت کہیں نہیں لگی اور آپؓ نے استعفاء دے دیا۔

حضرت خالدؓ جنگ کے مرد میدان تھے۔ آپؓ کے پورے جسم میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی، جو جراحت زدہ نہ ہو۔ اس کے باوجود بستر پر ملک الموت سے ملاقات کرنا ان کے لیے باعث

افسوس وحسرت رہا۔ آپؓ کو آثار نبویؐ سے اس قدر شغف تھا کہ موئے مبارک کو اپنی ٹوپی میں سلوا رکھا تھا اور اسے ہمیشہ زیب سر کیے رہتے تھے۔ آپؓ کے شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے حضور ﷺ نے ''سیف اللہ'' کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔ آپؓ نے جب غزوۂ موتہ میں علم ہاتھ میں لیا تو مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو یہ کہہ کر خبر دی کہ حَمِیَ الْوَطِیس (جنگ کی بھٹی گرم ہوگئی)۔ حضور ﷺ نے ایک بار یہ بھی فرمایا تھا کہ ''تم لوگ خالد کو تکلیف نہ دو کیوں کہ وہ کفار کے مقابلہ میں خدا کی تلوار ہے۔'' آپؓ کے مزاج میں تندی تھی لیکن ہٹ دھرمی نہ تھی۔ آپؓ نے میدان جنگ میں معزولی کو خلیفۃ المسلمین کی اطاعت میں بے چوں و چرا قبول کرلیا۔ بے نفسی کا یہ عالم کہ یرموک کے عملاً فاتح ہونے کے باوجود اس فتح کا سہرا حضرت ابوعبیدہؓ کے سر باندھ دیا۔ جنگ یرموک میں قیصر روم کے سفیر جارج نے آپؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔

(۱۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

فاطمہ نام اور زہراء لقب تھا۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادیوں میں سب سے کم سن تھیں۔ غالب روایات کے مطابق نبوت کے سال یا اس سے ایک سال قبل پیدا ہوئی تھیں۔ ذی الحجہ ۲ھ میں آپؓ کا نکاح حضرت علیؓ کے ساتھ ہوا۔ نکاح کے اخراجات اور مہر کے لیے حضور ﷺ کے مشورہ سے حضرت علیؓ نے اپنی زرہ فروخت کردی تھی۔ رخصتی کے بعد آپؓ حارثہ بن نعمان انصاریؓ کے مکان میں آئیں۔ آپؓ کا ولیمہ اس وقت کے معیار سے بہت شان دار تھا۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے ضروریات زندگی کے طور پر ایک بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا، جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، دو مٹی کے گھڑے، ایک مشک اور دو چکیاں عنایت فرمائی تھیں۔ یہ ایک طرح سے حضرت علیؓ کی مدد تھی کیوں کہ حضورؐ نے ان کی پرورش بھی اپنی اولاد کی طرح فرمائی تھی۔ حضرت فاطمہؓ نے تمام عمر نہایت عسرت کی زندگی گزاری اور یہی مقدس سامان تمام عمر ان کا اثاث البیت رہا۔ نکاح کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے بہتر شخص سے تمھارا نکاح کیا ہے۔

حضور ﷺ کو آپؓ سے اور آپؓ کو اپنے والد سے بے انتہا محبت تھی۔ آپؓ کی عمر انتیس سال تھی جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا۔ یہ صدمہ آپؓ کے لیے جاں کاہ تھا اس لیے صرف چھ

مہینہ بعد ان سے ملنے کے لیے عدم آباد کو سدھار گئیں۔ حضور ﷺ نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے ان کے کان میں یہ مژدہ سنا دیا تھا کہ خاندان میں سب سے پہلے وہی آپؐ سے ملیں گی۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اپنے اہل خاندان کے ساتھ اپنے باپ کی میراث کی دعوے دار ہوئیں لیکن جب حضرت ابو بکرؓ نے حضور ﷺ کا یہ فرمان سنایا کہ انبیاء کی میراث نہیں ہوتی، ان کا مال متروکہ صدقہ ہوتا ہے، تو آپؓ مان گئیں، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس سے حضرت فاطمہؓ کو ناراضی ہوئی اور انھوں نے تا عمر حضرت ابو بکرؓ سے کلام نہیں کیا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ بعد میں آپؓ خلیفۂ رسولؐ سے راضی ہو گئی تھیں۔ بہ ہر حال حضرت ابو بکرؓ نے آپؓ اور آپؓ کے پورے خاندان کا ہمیشہ خیال رکھا۔

آپؓ کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے کیوں کہ آپؓ کی تاریخ پیدائش ہی میں اختلاف ہے۔ انتیس سال کی عمر اس وقت ہوتی ہے جب کی آپ کی پیدائش بعثت سے پانچ سال پہلے تسلیم کی جائے۔ آپؓ کی قبر کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ بقیع میں سیدنا حسنؓ کے پاس مدفون ہیں اور بعض لوگوں کے مطابق دار عقیل میں اور بعض دیگر لوگوں کے مطابق اپنے ہی گھر میں مدفون ہیں۔

آپؓ رسول اللہ ﷺ کو اس قدر محبوب تھیں کہ جب حضرت علیؓ نے ابو جہل کی لڑکی کو پیغام نکاح بھیجا تو حضورؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ ''فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے، جو اس کو ناراض کرے گا، مجھ کو ناراض کرے گا۔'' ایک روایت میں ہے کہ ''جو اس کو اذیت دے گا مجھ کو اذیت دے گا۔''

آپؓ کی زندگی مجاہدہ اور زہد و ورع کا نمونہ تھی۔ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ اس کے باوجود جب آپؓ نے حضورؐ سے ایک لونڈی کی فرمائش کی تو جواب ملا کہ ''یتیم تم سے پہلے اس کے مستحق ہیں۔'' حضورؐ آپؓ کو زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ نے سونے کا ایک ہار تیار کیا تو حضورؐ نے فرمایا ''کیا تم لوگوں سے کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہؐ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے؟''

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

ایک غزوہ سے واپسی پر آپؓ نے حضورؐ کے استقبال کے لیے گھر میں پردے لٹکائے اور حضرات حسن و حسین کو چاندی کے کنگن پہنائے تو حضورؐ کو ناگوار ہوئی اور واپس چلے گئے۔ آپؓ نے فوراً کنگن اتار دیے اور پردہ چاک کر دیا۔ حضورؐ کو آپؓ سے اتنی محبت تھی کہ کسی غزوہ سے واپس آتے تو سب سے پہلے آپؓ کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور جب سیدہؓ آپؐ کے پاس تشریف لاتی تھیں تو کھڑے ہو کر استقبال کرتے اور پیشانی کا بوسہ دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو علیؓ اور فاطمہؓ دونوں محبوب تھے اس لیے کبھی دونوں میں شکر رنجی ہوتی تو آپؐ دونوں میں میل ملاپ کرا دیتے تھے۔ ایک بار حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ کی شکایت کے لیے حضور ﷺ کے پاس تشریف لائیں تو حضرت علیؓ بھی پیچھے پیچھے آئے اور کہا کہ "اب تمھارے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ کروں گا۔"

آپؓ کی فضیلت کے لیے یہ کافی ہے کہ آپ دنیا کی تمام عورتوں کی سردار، تمام جنتی خواتین سے افضل اور رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والی خاتون ہیں۔

(۱۵) حضرت حسن رضی اللہ عنہ

پانچویں خلیفۂ راشد حضرت حسن بن علیؓ کی کنیت ابو محمد، سید اور ریحانۃ النبی خطاب اور لقب شبہ رسولؐ تھا۔ آپؓ شباہت میں اپنے نانا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کے ایک سال کے اندر ہی تیسری ہجری میں نور افزائے عالم وجود ہوئے۔ خبر ملتے ہی حضورؐ، حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لائے۔ حسن نام رکھا۔ پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کیا۔ دو مینڈھوں کی قربانی دی اور سر کے بالوں کے برابر چاندی خیرات کی۔ آپؓ کی پرورش آں حضور ﷺ کی آغوش شفقت میں ہوئی۔ آپؓ رسول ﷺ کی گودوں میں کھیلتے اور دوش مبارک پر سوار ہوتے، یہاں تک کہ نمازوں میں کبھی پشت مبارک پر سوار ہوتے اور کبھی ٹانگوں کے بیچ سے نکل جاتے تھے۔ آپؓ کا سن آٹھ سال کا تھا جب آپؓ کے نانا جان راہیِ ملک بقا ہوئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی حضرت حسنؓ سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ راستے میں اگر ملتے تو کندھے پر بٹھا لیتے تھے۔ یہی سلوک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آپؓ اور آپؓ کے بھائی

حضرت حسینؓ کے ساتھ تھا۔ آپ دونوں کا وظیفہ کبار صحابہ کے برابر تھا۔ آپؓ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جوانی کی عمر کو پہنچے۔

آپؓ کی عملی زندگی کا آغاز طبرستان کی جنگ میں مجاہدانہ شرکت سے ہوتا ہے۔ جب حضرت عثمانؓ کا باغیوں نے محاصرہ کرلیا تو آپؓ نے اپنے والد حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ وہ مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں کیوں کہ اگر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا تو لوگ انھیں کو ذمے دار ٹھیرائیں گے لیکن باغیوں نے انھیں مدینہ سے باہر نہیں جانے دیا۔ آپؓ اور آپ کے بھائی حضرت حسینؓ کو والد کی طرف سے حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا۔ آخر وقت میں آپؓ نے نہایت شجاعت اور دلیری کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی مدافعت کی یہاں تک کہ آپؓ کا پورا بدن خون سے رنگین ہو گیا۔ لیکن باغی چھت پر چڑھ گئے اور حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد آپؓ نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام بلاد اسلامیہ کے استصواب کے بغیر خلافت کے قبول کرنے سے منع کیا لیکن انھوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ جنگ جمل میں جب حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہ کھل کر سامنے آگئے تو آپؓ کو بھی حضرت علیؓ کی حمایت میں نکلنا پڑا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جامع کوفہ میں فتنہ و فساد میں پڑنے سے لوگوں کو منع کر رہے تھے، آپ نے وہاں پہنچ کر ان کو روک دیا اور حضرت علیؓ کی حمایت میں تقریر کی۔ جنگ جمل کے بعد جنگ صفین واقع ہوئی۔ اس موقعہ پر جو التوائے جنگ ہوا تھا اس کے آپؓ شاہد تھے۔

جب حضرت علیؓ پر ابن ملجم نے قاتلانہ حملہ کیا تو انھوں نے جمعہ کی امامت حضرت حسنؓ کے سپرد فرمائی۔ حضرت علیؓ زخمی ہونے کے تین دن بعد رہ گزار ملک عدم ہوئے تو حضرات حسنینؓ اور جعفرؓ نے انھیں غسل دیا اور حضرت حسنؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد تمام لوگوں نے آپؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی۔ اس طرح آپؓ پانچویں خلیفۂ راشد ہوئے۔ اس وقت تک سوائے حضرت معاویہؓ کے کوئی اور اس عقد بیعت سے الگ نہیں تھا۔ امیر معاویہؓ کو آپؓ کی بے نفسی کا پورا اندازہ تھا اور حضرت حسنؓ بھی اپنی صلح پسندی کی بنا پر یہ طے کیے ہوئے تھے کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو کچھ مراعات حاصل

کر کے معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہو جائیں گے۔ جب معرکہ کی نوبت آئی تو آپؓ نے دیکھا کہ بہت سے لوگ پہلو تہی کر رہے ہیں۔ چناں چہ آپؓ نے مصالحانہ خطبہ دیا، جس سے خوارج ناراض ہو گئے اور جراح بن قبیصہ خارجی نے راستے میں حملہ کر کے آپؓ کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد آپؓ مدائن آ گئے۔ اور جب امیر معاویہؓ اپنا لشکر لے کر انبار تک پہنچ گئے تو عبداللہ بن عامر نے امیر معاویہؓ کی طرف سے التوائے جنگ کا پیغام دیا، جسے حضرت حسنؓ کے حامیوں نے قبول کر لیا۔ لیکن ان کے ہٹتے ہی عبداللہ بن عامر نے آگے بڑھ کر مدائن کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت حسنؓ اس صورت حال سے بہت دل گیر تھے اس لیے انھوں نے چند شرائط کے ساتھ خلافت حضرت معاویہؓ کے سپرد کر دی اور ان کی فرمائش پر مجمع عام میں اپنی دست برداری کا اعلان فرمایا۔ بعض روایات کے مطابق حضرت معاویہؓ نے ایک سادہ کاغذ آپؓ کے پاس بھجوا دیا تھا کہ جو شرائط چاہیں لکھ لیں۔ اس طرح حضور ﷺ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ''میرا یہ بیٹا سید ہے۔ خدا اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو فرقوں میں صلح کرائے گا۔'' آپؓ کی مدت خلافت ساڑھے پانچ یا چھ مہینے ہے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی کہ ''میرے بعد خلافت حقہ تیس سال رہے گی۔''

آپؓ کا آخری وقت مدینہ طیبہ میں گزرا۔ موت کا سبب وہ زہر تھا، جو آپؓ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے آپؓ کو کھلا دیا تھا۔ بعض لوگ الزام لگاتے ہیں کہ یہ زہر حضرت معاویہؓ کے اشارے پر دیا گیا تھا لیکن یہ بات متحقق نہیں ہے۔ آپؓ کو حضرت عائشہؓ کی طرف سے حجرۂ نبویؐ میں دفن ہونے کی اجازت مل گئی تھی لیکن مروان کے اعتراض کرنے پر بقیع الغرقد میں اپنی والدہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ سعید بن العاصؓ گورنر مدینہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آپؓ کو رسول اللہ ﷺ سے کم لیکن حضرت علیؓ سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا تھا اس لیے مدینہ کے اہل علم و افتاء میں آپؓ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ آپؓ کی مرویات کی تعداد صرف تیرہ ہے۔ آپؓ کو خطابت میں ملکہ حاصل تھا۔ آپؓ کے بہت سے حکیمانہ اقوال ہیں۔ آپؓ زہد و ورع اور مکارم اخلاق کا مجسم پیکر تھے۔ آپؓ کی صلح پسندی کا ثبوت خلافت سے دست برداری ہے۔ فیاضی اور سیر چشمی آپؓ کا خاندانی وصف تھا۔ ضبط و تحمل کا یہ حال تھا کہ مروان خطبہ میں حضرت علیؓ

کے ساتھ گستاخیاں کیا کرتا تھا لیکن آپؓ نے اس کے جواب میں صرف یہ کہا کہ "اللہ منتقم ہے۔"" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "حسن اور حسین جنت کے دو پھول ہیں۔"

(۱۶) حضرت حسین رضی اللہ عنہ

حسین نام، ابو عبداللہ کنیت، "سید شباب اہل الجنۃ" اور "ریحانۃ النبی" لقب، علی مرتضیٰؓ باپ اور سیدہ بتولؓ جگر گوشۂ رسولؐ ماں تھیں۔ حضرت حسنؓ کی طرح آپؓ کی ذات گرامی قریش کا خلاصہ اور بنو ہاشم کا عطر تھی۔

آپؓ حضرت حسنؓ سے صرف ایک سال چھوٹے تھے۔ آپؓ کی پیدائش پر حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو عقیقہ کرنے اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی خیرات کرنے کا حکم دیا تھا۔ شفقت، محبت اور لاڈ پیار میں آپؓ اپنے بڑے بھائی حضرت حسنؓ کے ساتھ تھے اور حضور ﷺ دونوں سے یکساں محبت اور لاڈ فرماتے تھے۔ آپؓ کا سن صرف سات برس کا تھا جب حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں بھی آپؓ کم سن تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری عہد تک جوانی کو پہنچ چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپؓ دونوں بھائیوں کا وظیفہ بدری صحابیوں کی طرح دو دو ہزار کے بجائے پانچ پانچ ہزار مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ کسی بھی معاملے میں ان دونوں بھائیوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے اور اپنے صاحب زادہ عبداللہؓ پر فوقیت دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ میرے باپ کے ممبر پر سے اترو اور اپنے باپ کے ممبر پر جاؤ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ میرے باپ کا تو کوئی ممبر ہی نہیں ہے، پھر انھیں اپنے گود میں بٹھالیا۔

۳۰ھ میں حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اپنے بھائی کے ساتھ طبرستان کی مہم میں شریک ہوئے۔ جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا تو حضرت علیؓ نے اپنے دونوں صاحب زادگان کو ان کی حفاظت پر مامور کیا تھا اور ان کی شہادت کے بعد گوش مالی بھی کی تھی۔

جنگ جمل اور صفین میں وہ اپنے والد کے ہم رکاب تھے۔ جنگ جمل کے بعد حضرت عائشہؓ کو پہنچانے کے لیے کئی میل تک مشائعت کی تھی۔ صفین میں التوائے جنگ کے معاہدے پر آپؓ کے بھی دستخط تھے۔ حضرت علیؓ نے اپنی شہادت کے وقت دونوں صاحب زادگان کو قیمتی

نصیحتیں کی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہؒ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی تھی۔ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے اور چھ مہینہ سے پہلے ہی جب وہ حضرت معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہونے لگے تو آپؓ نے سخت مخالفت کی۔ گو آپؓ حضرت معاویہؓ کو خلافت کا حق دار نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کی ماتحتی میں جنگی مہمات میں برابر حصہ لیتے تھے۔ ۴۹ھ میں قسطنطنیہ کی مشہور مہم میں، جس کا کمانڈر یزید تھا آپؓ نے مجاہدانہ شرکت کی تھی۔ اسی سال حضرت حسنؓ کا انتقال ہوا تھا۔ حضرت معاویہؓ کی زندگی تک حضرت حسینؓ کے تعلقات ان سے برقرار رہے اور معاویہؓ نے بھی ان کا ہمیشہ خیال اور لحاظ رکھا۔ لیکن یزید کی ولی عہدی پر آپؓ راضی نہ تھے۔ آپ مدینہ کے ان چند آدمیوں میں شامل تھے، جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ حضرت معاویہؓ بہت چالاک اور دور اندیش آدمی تھے۔ انھوں نے یزید کو پہلے ہی خبر دار کر دیا تھا کہ ''میرے بعد عبد اللہ بن زبیرؓ خلافت کا دعویٰ ضرور کریں گے اور عراق والے حسینؓ کو بھی مقابلے میں لائیں گے، تو جب تم غلبہ حاصل کر لینا تو حسینؓ کے ساتھ رواداری سے کام لینا اور عبد اللہ بن زبیرؓ کو قتل کر دینا۔''

۶۰ھ میں حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید تخت نشین ہوا تو اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ابن زبیرؓ اور حسینؓ سے بیعت لینے کا تھا کیوں کہ پورا حجاز ابن زبیرؓ کے ساتھ اور پورا عراق حسینؓ کے ساتھ تھا۔ یزید نے تخت نشین ہوتے ہی ولید بن عقبہ حاکم مدینہ کو ان دونوں سے بیعت لینے کا حکم دیا لیکن یہ دونوں ہی ایک دن آگے پیچھے مدینہ سے نکل گئے اور مکہ کو مستقر بنایا۔ حضرت علیؓ کی وجہ سے کوفہ والے اہل بیت کے حمایتی تھے اس لیے انھوں نے سیدنا حسینؓ کے پاس پے در پے خطوط بھیجنا شروع کر دیے۔ لوگوں نے آپؓ کو وہاں جانے سے روکا لیکن آپؓ وہاں جانے کا عزم کر چکے تھے۔ پھر بھی پہلے آپؓ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو وہاں کا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ وہاں ان کی زبردست پذیرائی ہوئی، جس سے متأثر ہو کر انھوں نے سیدنا حسینؓ کو فوراً پہنچنے کا پیغام بھیج دیا۔ لیکن جب دمشق سے عبید اللہ بن زیاد کو تاکیدی حکم ہوا کہ مسلم کو فوراً شہر بدر کیا جائے تو ایک ایک کر کے لوگ چھٹنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ مسلم کو پہلے ہانی پھر بعد میں طوعہ نامی ایک خاتون کے گھر میں پناہ لینی پڑی۔ یہاں خود طوعہ کے بیٹے کی

جاسوسی کی بنا پر عبیداللہ کی فوج نے آ کر گھیر لیا اور آپؓ بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

مکہ اور مدینہ کی تمام سرکردہ شخصیات اہل کوفہ کی غداریوں سے واقف تھیں، اس لیے تمام جلیل القدر صحابہ بہ شمول عمرو بن عبدالرحمٰنؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ، یہاں تک کہ حضرت حسینؓ کے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہؒ نے، جو ان جگہوں پر موجود تھے آپؓ کو کوفہ جانے سے منع کیا لیکن اپنے حسن ظن کی بنا پر آپؓ وہاں جانے پر مصر رہے۔ راستہ میں اہل بیت کے حامی مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ اس نے عراق کے حالات دریافت کیے جانے پر یہ جواب دیا ''لوگوں کے دل آپؓ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں بنوامیہ کے ساتھ ہیں۔ قضائے الٰہی آسمان سے اترتی ہے۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' راستے میں جو بھی ملا اس نے آپؓ کو واپس جانے کا مشورہ دیا۔ عمرو بن سعید حاکم مکہ نے بھی خط لکھ کر آپؓ سے واپس آنے کی استدعا کی۔ لیکن یہ ساری کوششیں رائگاں گئیں اور آپؓ منزلیں طے کرتے ہوئے کوفہ کے میدان نینوا میں کربلا کے مقام پہنچ گئے۔ آپؓ کو راستہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ اہل کوفہ کی وفاداریاں تبدیل ہو چکی ہیں اور ابن زیاد سے کافی ردوکد کے بعد نہ چاہنے کے باوجود ابن سعد آپؓ سے مقابلہ کے لیے چار ہزار سواروں کے ساتھ ۳؍محرم ۶۱ھ ہی کو پہنچ گیا۔ آپؓ نے دشمن کی فوج کے سامنے ایک پراثر تقریر کی۔ رسول اللہ ﷺ سے اپنی قرابت کا واسطہ دیا اور ابن سعد کے سامنے تین تجویزیں رکھیں: (۱) انھیں واپس ہو جانے دیا جائے، یا (۲) یزید کے پاس بھیج دیا جائے، یا (۳) سرحد پر جنگ کے لیے بھیج دیا جائے۔ یہ تینوں تجویزیں انتہا درجہ معقول تھیں کیوں کہ اس میں خون خرابے سے گریز اور امت مسلمہ کی بہتری تھی۔ لیکن ابن سعد پر ابن زیاد کا اتنا دباؤ تھا کہ اس نے غیر مشروط حوالگی کے سوا حضرت حسینؓ کی ایک نہ سنی اور اہل بیت کا پانی بھی بند کر دیا۔ سیدنا حضرت حسینؓ کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ خود کو ان لوگوں کے حوالہ کریں، جنھیں اللہ کا خوف، دین کی سربلندی اور آل رسولؐ کی حرمت کا پاس نہ ہو۔ ابن سعد نے ۹؍محرم ۶۱ھ کو جنگ کی تیاری کی لیکن سید عالی مقامؓ نے عبادت اور استغفار کے لیے ایک رات کی مہلت طلب کر لی۔ ۱۰؍محرم الحرام کو بہتر (۷۲) جاں نثاران آل رسولؐ نے چار ہزار اعدا کے لشکر سے مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ پھر افراد خاندان بنی ہاشم اس سعادت میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد سیدنا حضرت حسینؓ نے اپنی جان جان آفریں کے حوالے کی۔

معرکہ کربلا کی روداد پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے والے آپؐ کے اولاد اطہار سے ایسا ظالمانہ سلوک کر سکتے ہیں۔ پورے خانوادے کی اور آپؓ کی شہادت، جس مظلومانہ انداز میں ہوئی اس کا تصور کر کے آنکھیں لبریز ہو جاتی ہیں اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ لیکن سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ جس مقصد عظیم کے لیے آپؓ نے قربانی دی یعنی خلافت کو ملوکیت میں تبدیل ہونے سے روکنا، وہ کام اللہ کی مشیت کے تحت نہیں ہو پایا۔ ذالك تقدير العزيز العليم۔

آپ کے فضائل کے باب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپؓ دوش رسولؐ کے سوار اور جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔

(۱۷) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کی کنیت ابوالعباس تھی۔ آپؓ کی والدہ کا نام ام الفضل تھا۔ آں حضرتؐ کے چچا زاد بھائی اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل شعب ابی طالب میں آپؓ کی پیدائش ہوئی۔ آپؓ کی والدہ حضرت خدیجہؓ کے بعد ایمان لانے والی سب سے پہلی خاتون تھیں اس لیے یوم ولادت ہی سے آپؓ نے اسلام کی لوریوں میں پرورش پائی۔

آپؓ کے والد حضرت عباسؓ ۸ھ میں ایمان لائے اور مدینہ ہجرت کی۔ اس وقت آپؓ کی عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت آپؓ کو اپنی آغوش عاطفت میں بٹھا کر اور دست شفقت پھیر کر یہ دعا فرمائی تھی ''اے خدا! اس میں برکت نازل فرما اور اس کے علم کی روشنی پھیلا۔'' اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے چہیتے تھے اس لیے کبھی کبھی ان کے گھر رات میں رہ جاتے تھے۔ اس طرح انھیں آں حضرتؐ کی گھریلو زندگی اور رات کے معمولات کا علم ہوا۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے لیے وضو کا پانی لا دیا کرتے تھے اور راتوں کو آپؐ کے ساتھ نماز بھی پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بار رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کے علم میں اضافے کی دعا فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت آپ صرف تیرہ سال کے تھے۔ حضرت عمرؓ کے

زمانے میں شباب کو پہنچے تو انھوں نے ان کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔ اس طرح آپؓ کو اکابر صحابہؓ سے مستفید ہونے کا موقع حاصل ہوگیا۔ کم سنی کے باوجود حضرت عمرؓ کبھی کبھی آپؓ سے مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے زمانے میں آپؓ کو جرجیر شاہ کے پاس افریقہ جانے کا اتفاق ہوا تو ان کی ذہانت اور طباعی دیکھ کر وہ بولا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی متبحر عالم ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے ۳۵ھ میں اپنے زمانۂ محصوری میں آپؓ کو امیر الحاج بنا کر مکہ روانہ کیا تھا۔ ان کی واپسی تک حضرت عثمانؓ کو شہید کیا جا چکا تھا۔ خلافت کے لیے آپؓ نے اس وقت حضرت علیؓ کے حق میں رائے دی تھی، لیکن حضرت علیؓ کو ، جو مشورے انھوں نے دیے تھے اگر وہ ان پر عمل کر لیتے تو امت زیادہ فتنے میں مبتلا نہ ہوتی۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں آپؓ نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ صفین کے بعد جب ثالثی کا مسئلہ پیش ہوا تو آپؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو حضرت عمرو بن عاصؓ کے دھوکے سے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ لیکن اپنے حسن ظن کی بنا پر جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کی معزولی کا اعلان کیا تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے حضرت علیؓ کی معزولی کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوگیا اور تحکیم انسانی کے خلاف خارجیوں کا ظہور ہوا۔ نہروان کی جنگ کے بعد، جس میں خارجیوں کو شکست ہوئی تھی حضرت علیؓ نے آپؓ کو بصرہ کے علاوہ ایران کی گورنری پر مامور کیا تھا اور انھوں نے وہاں کی تمام شورشوں اور بغاوتوں پر قابو پالیا تھا۔

۴۰ھ میں آپؓ نے مکہ میں عزلت گزینی اختیار کر لی۔ یزید کے خلاف جب کوفہ والوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لیے بلایا تو آپؓ نے اپنے تجربہ کی بنا پر انھیں سختی سے وہاں جانے سے روکا۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ میں خلافت کا دعویٰ کیا تو اپنی عزلت گزینی کی وجہ سے آپؓ نے ان کی بیعت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ آپؓ کے حامیوں کی ایک جماعت کوفہ سے مکہ آچکی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا قصہ پاک کر دیا جائے لیکن آپؓ نے حرم پاک کے تقدس کو پامال کرنے سے انکار کر دیا۔

۶۸ھ میں ہفت روزہ علالت کے بعد آپؓ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

محمد بن حنفیہؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور کہا ''خدا کی قسم! آج دنیا سے حبر امت اٹھ گیا۔''

فضل وکمال کے اعتبار سے حضرت ابن عباسؓ عہد مبارک کے ممتاز ترین علماء میں تھے۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب اور شاعری، غرض ہر علم میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ قرآن پاک کی تفسیر وتاویل، آیات قرآنی کے شان نزول اور ناسخ ومنسوخ کے علم میں آپؓ کا ہمسر کوئی نہیں۔ حضرت عمرؓ ان کی کم عمری کا لحاظ کیے بغیر انھیں اکابر صحابہؓ کے ساتھ بٹھاتے تھے۔ آپؓ نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کے اعتراض کرنے پر جب ابن عباسؓ کے سامنے لوگوں سے سورۂ نصر کا مفہوم دریافت کیا تو لوگوں نے اس کا ظاہری مفہوم بتلایا لیکن حضرت ابن عباسؓ نے بتایا کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے رحلت کی خبر دی گئی ہے۔ آپؓ تفسیر قرآن میں الفاظ کے عام معنی کو پسند کرتے تھے۔ اہل بیت سے تعلق رکھنے کے باوجود آیت مودة فی القربی کے مفہوم کو آپؓ نے اہل بیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ تمام قرابت داروں تک وسیع کر دیا۔ حضرت عمرؓ آپ کی مہارت قرآن کے اس قدر معترف تھے کہ سائلین قرآن کو آپؓ کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور ان کے جوابات بھی معلوم کرتے تھے۔

علم حدیث میں بھی آپؓ کو ملکہ حاصل تھا۔ آپؓ مکثر الروایات (صاحب روایات کثیرہ) ہیں۔ آپؓ کی مرویات کی مجموعی تعداد ۲۶۶۰ ہے۔ ان میں سے ۷۵ متفق علیہ ہیں۔ ۱۸ میں بخاری اور ۴۹ میں مسلم منفرد ہیں۔ بقیہ احادیث دوسرے مجموعوں میں ہیں۔ آپؓ احادیث کی تلاش میں در در کا چکر لگاتے تھے۔ صحابۂ کرام اختلاف مسائل میں آپؓ سے رجوع کرتے تھے۔ مکہ میں علم الفقہ کی بنیاد آپؓ کی ڈالی ہوئی ہے۔ آپؓ کو فرائض (علم میراث) پر بھی عبور تھا۔

آپ بچپن سے صاحب علم لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں خلفاء کے آپ مشیر تھے۔ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو مرتبہ دیکھا تھا۔ آپ نے قرآن کی بعض سورتیں بھی جمع کی تھیں۔ آپؓ معاصرین کی عزت کرتے تھے اور بدعات سے متنفر تھے۔ امت نے آپؓ کو حبر الامت کا خطاب دیا ہے۔ آپؓ کا شمار ''عبادلۂ اربعہ'' (عبداللہ نام کے چار صحابیوں) میں ہوتا ہے۔

(۱۸) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

آپؓ کا نام عبداللہ اور کنیت عبدالرحمٰن تھی۔ والد کا نام مسعود اور والدہ کا نام ام عبد تھا۔ ایک طویل سلسلہ کے بعد آپؓ کا شجرۂ نسب مضر تک پہنچتا ہے۔ مکہ میں جب توحید کا غلغلہ شروع ہوا تو یہ عقبہ بن ابومعیط کی بکریاں چراتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک معجزے سے متاثر ہوکر دولت ایمان سے سرفراز ہوئے، جب کہ آپ کا دست مبارک ایک بکری کے تھن پر پڑا اور اس کے تھنوں میں دودھ آگیا حالاں کہ وہ دودھار و نہیں تھی۔ اس دودھ سے رسول خداؐ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تینوں شکم سیر ہوئے تھے۔ آپؓ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ تم تعلیم یافتہ بچے ہو۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بہ راہ راست ستر سورتوں کی تعلیم حاصل کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو اپنا خادم خاص بنا لیا تھا۔ آپؓ نے سب سے پہلے قریش کی انجمن میں بلند آواز سے ''سورۃ الرحمٰن'' کی تلاوت کی اور پٹ پٹا کر مجمع اسلام میں واپس آئے۔

عبداللہ بن مسعودؓ نے حبشہ کی دونوں ہجرتیں اور پھر مدینہ کی تیسری ہجرت کی۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے آپؓ کا بھائی چارہ تھا۔ بدر سے لے کر حنین تک تمام معرکوں میں آپؓ شریک رہے۔ غزوۂ حنین میں جان پر کھیل کر اسّی (۸۰) دیگر صحابہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی یہاں تک کہ کفار کے قدم اکھڑ گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپؓ عزلت گزیں ہوگئے تھے لیکن حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جنگ یرموک میں خوب داد شجاعت دی۔ ۲۰ھ میں کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ بیت المال کا اہتمام بھی آپؓ کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں آپؓ نے فیصلے نمٹانے کا بھی کام کیا اور اس میں تفقہ اور اجتہاد کی پوری رعایت رکھی اور شک کا فائدہ ملزم کو دیا۔ لیکن ابن نواحہ کو، جس نے مسیلمہ کذاب کے رسالت کی گواہی دی تھی اور اس وقت تک تائب نہیں ہوا تھا قتل کی سزا دی۔ امانت کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس معاملے میں آپؓ کا حضرت سعد ابن وقاصؓ سے سخت اختلاف ہوگیا۔ لیکن چوں کہ حضرت سعدؓ مستجاب الدعوات کی حیثیت سے مشہور تھے اس لیے آپؓ نے ان سے کہا کہ ''دیکھو! میرے لیے بددعا نہ کرنا۔'' آپؓ اپنے عہدے پر حضرت عثمانؓ کے زمانے تک

برقرار رہے۔ لیکن بعد میں معزول ہونے پر عمرہ کا قصد کیا۔ مدینہ سے قریب ربذہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد ان کی بیوہ کو مدینہ لا کر حضرت عثمانؓ کے سپرد کیا۔

ساٹھ سال کی عمر میں بیمار پڑے۔ حضرت عثمانؓ آپسی شکر رنجی دور کرنے کی غرض سے ان کی عیادت کو حاضر ہوئے۔ اور ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق اس ملاقات کے نتیجے میں دونوں کے دل صاف ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آخر وقت میں حضرت زبیر بن عوامؓ اور ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اپنے مال و اسباب نیز اہل و عیال اور تجہیز و تکفین کے بارے میں وصیت فرمائی۔ مستند روایات کے مطابق آپؓ کی نماز جنازہ حضرت عثمانؓ نے پڑھائی۔

آپ صغر سنی (دس سال) ہی میں قرآن اور فرائض کے علم کے ماہر ہوگئے تھے۔ آپ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی خوش خبری ہے کہ یوم قیامت آپ کے پاؤں کا وزن کوہ احد سے زیادہ ہوگا۔ آپؓ کا شمار بھی ''عبادلۂ اربعہ'' میں ہوتا ہے۔

(۱۹) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن عمرؓ کا شجرۂ نسب حضرت عمرؓ کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ پیدائش کا تخمینی زمانہ بعثت نبوی کا دوسرا سال ہے۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے وقت ان کا سن تقریباً پانچ برس تھا۔ اس طرح اسلام آپؓ کو بچپن ہی میں مل گیا تھا۔ مکہ میں آپؓ کا خاندان بھی مشرکین کے ظلم و ستم سے محفوظ نہیں تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اپنے پورے عیال کے ساتھ مدینہ ہجرت کی تھی۔ بدر اور احد کے غزوات کے وقت حضرت عبداللہؓ صغیر السن تھے لیکن غزوۂ خندق کے وقت چوں کہ یہ پندرہ سال کے ہوگئے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انھیں جنگ میں شرکت کی اجازت دے دی۔ بیعت رضوان میں اپنے والد سے پہلے آپؓ کو رسول اللہ ﷺ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ غزوۂ خیبر میں آپؓ کو شرکت کی سعادت اور حلال و حرام کی حدیث روایت کرنے کی فضیلت حاصل ہے۔ فتح مکہ کے وقت خانۂ کعبہ میں داخل ہونے والے چوتھے فرد

ہیں۔ طائف اور حنین کی جنگوں اور غزوۂ تبوک میں آپؓ شریک رہے ہیں۔ حجۃ الوداع میں حضور اکرم ﷺ کی ہمراہی کے شرف میں بھی آپؓ شریک ہیں۔

عہد صدیقی میں آپؓ کے حالات کا کوئی ذکر کتابوں میں نہیں ملتا لیکن عہد فاروقی کی فتوحات میں آپؓ برابر شریک رہے ہیں۔ جنگ نہاوند میں آپؓ کے بیمار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح شام اور مصر کی جنگوں میں آپ کا جانا بھی ثابت ہے۔

آپؓ کے والد حضرت عمرؓ نے کسی کو اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے بعد خلافت کی مجلس شوریٰ میں آپؓ شامل تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو ان چھ افراد کی فہرست سے خارج رکھا تھا، جن میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرنا تھا۔

آپؓ نے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا لیکن جہاد میں برابر شریک رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے آپؓ کو خلیفہ بنانا چاہا بلکہ نہ بننے پر قتل کی دھمکی بھی دی لیکن آپؓ نے قبول نہیں کیا۔ آپؓ نے حضرت علیؓ کی مشروط بیعت کی تھی کہ فتنوں کی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے چناں چہ جنگ جمل اور صفین میں کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ جنگ صفین کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے خلافت کے لیے آپ کا نام پیش کیا تھا لیکن حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ آپؓ نے بعد میں حضرت معاویہؓ کی بیعت کر لی تھی اور قسطنطنیہ کی جنگ میں شریک رہے تھے۔ یزید کی بیعت انھوں نے بہ طیب خاطر نہیں بلکہ فتنے سے بچنے کے لیے کی تھی۔ انھوں نے اگرچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلاف پر بیعت نہیں کی لیکن خانۂ کعبہ پر حجاج کی سنگ باری پر سخت برہم ہوئے تھے۔ آپؓ نے عبدالملک بن مروان کی خلافت پر تحریری بیعت نامہ بھیج دیا تھا۔ عبدالملک آپؓ کا بڑا احترام واکرام کرتا تھا۔ اس نے حجاج کو ہدایت کی تھی کہ آپ کی مخالفت نہ کرے۔ چوں کہ حجاج سے آپ کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں اس لیے یہ حکم اس کو بہت شاق گزرا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی لیے اس نے کسی سے ایک زہریلے نیزے کی انی سے آپ کا پاؤں زخمی کرا دیا تھا، جس کی وجہ سے ۷۴ھ میں چوراسی سال کی عمر میں آپؓ کی وفات ہوگئی۔ آپؓ کی تدفین مکہ میں ہوئی۔

آپؓ مخزن علوم اور قرآن، تفسیر، حدیث وفقہ وغیرہ تمام علوم مذہبی کا بحر بے کراں تھے۔

تلاوت سے شغف تھا۔ تدبر قرآن میں عمر کا ایک حصہ گزارا۔ صرف سورۃ البقرہ پر غور وفکر میں چودہ سال گزارے۔ آپؓ کو فہم قرآنی میں بہت سے صحابہؓ پر تفوق حاصل تھا۔ آپؓ قرآن کی وسیع المعنی مفہوم میں تفسیر کیا کرتے تھے۔ آپؓ نے ''شجر طیبہ''، ''دلوک''، ''کنز'' اور ''فتنہ'' کی جو تشریح کی ہے وہ بہت جامع ہے۔ آپ کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ آپ کی مرویات کی تعداد ۱۶۳۰ ہے۔ ان میں سے ۱۷۰ احادیث متفق علیہ، ۸۱ صرف بخاری میں اور ۳۱ صرف مسلم میں ہیں۔ آپ احادیث کی طلب، جستجو اور اس کی اشاعت کیا کرتے تھے۔ آپ روایت بالمعنی کے برخلاف روایت بالالفاظ کے قائل تھے، اس لیے آپ کی تمام مرویات شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ لوگ آپ سے فتاوے حاصل کیا کرتے تھے لیکن فتویٰ دینے میں آپ بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک ایک مسکین ساتھ نہ ہو آپ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ لوگوں سے سلام کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے آپ بازار جایا کرتے تھے۔ فتنہ وفساد اور جنگ سے آپ کو کراہیت تھی اس لیے جنگ صفین سے آپ علیحدہ رہے۔ آپؓ کا شمار ''عبادلۂ اربعہ'' میں ہوتا ہے۔

(۲۰) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

عبداللہ نام، ابوبکر اور حبیب کنیت، والد ماجد کا نام زبیر اور والدہ محترمہ کا نام اسماء، والد اور والدہ دونوں طرف سے قریشی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نسب ہیں۔ آپؓ کی ذات گرامی اپنی قرابتوں کے لحاظ سے شرف ومکرم کی حامل تھی۔ والد زبیرؓ آں حضرتؐ کے حواری اور یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی پھوپھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہؓ آپ کی دادی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے نانا، ذات النطاقین حضرت اسماءؓ آپ کی والدہ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ آپ کی خالہ ہیں۔ آپؓ کی پیدائش کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ آپؓ مہاجرین مدینہ کی پہلی اولاد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدائش کے بعد تبرکاً کھجور چبا کر آپ کے دہن مبارک میں ڈالا تھا۔ آپؓ نے آٹھ سال کی عمر میں آں حضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ بچپن ہی سے جری، بے باک اور خود اعتماد تھے۔ غزوۂ خندق میں ان کی عمر چار یا پانچ سال تھی لیکن ایک ٹیلہ پر سے جنگ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس سے ان کے تہور اور

بے خوفی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں اوائل عمری ہی میں اپنے والد کے ہمراہ جنگ یرموک میں حصہ لیا تھا۔ آپؓ کے اصل کارناموں کا آغاز عہد عثمانی سے ہوتا ہے۔ افریقہ میں طرابلس کی فتح آپؓ کے حسن تدبیر سے ہوئی تھی۔ طرابلس کے علاوہ آپؓ نے طبرستان کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے محاصرہ کے وقت آپ ان کی حفاظت پر متعین تھے۔

جنگ جمل میں آپؓ کے والد حضرت زبیرؓ رسول اللہ ﷺ کی ایک پیشین گوئی کی بنا پر واپس ہو گئے تھے لیکن آپ اپنی خالہ حضرت عائشہؓ کی حفاظت میں سر بکف تھے۔ آپ نے صفین کی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے جب یزید کو ولی عہد بنایا تو اس کی سخت مخالفت کی اور جب حضرت معاویہؓ یزید کی ولی عہدی کی بیعت لینے کے لیے مدینہ آئے تو آپؓ ہی نے صحابہؓ کی طرف سے گفتگو فرمائی اور انھیں لاجواب کر دیا۔ حضرت معاویہؓ نے اسی لیے اپنی وفات کے وقت یزید کو آپؓ کی طرف سے خبردار کر دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ قابو پانے کے بعد انھیں زندہ نہ چھوڑنا۔

یزید کے خلیفہ مقرر ہو جانے کے بعد اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بجائے آپؓ مکہ چلے آئے۔ جب حضرت حسینؓ مکہ آئے تو آپ نے انھیں کوفہ جانے سے منع کیا لیکن چوں کہ وہ عبداللہ بن زبیرؓ کو بھی خلافت کے امیدواروں میں سمجھتے تھے اس لیے ان کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد یزید نے پھر شامیوں کا ایک وفد آپؓ کے پاس بھیجا لیکن آپ نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور مکہ اور حجاز میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس وقت عبداللہ بن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کو چھوڑ کر سبھوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اس پر شام کے لشکر نے مدینہ پر لشکر کشی کر کے اسے خوب لوٹا۔ اس کے بعد یہ لشکر عازم مکہ ہوا اور جبل بوقبیس پر منجنیق نصب کر کے خانۂ کعبہ پر سنگ باری شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس وقت حرم میں پناہ گزیں تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا شمار قریش کے ان اولوالعزم اور حوصلہ مند بہادروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اس عہد کی سب سے بڑی سلطنت کا تن تنہا مقابلہ کیا۔ آپؓ کا عہد حکومت ایک

دور پرفتن تھا لیکن آپؓ رعایا کی خبر گیری سے کبھی غافل نہیں رہے۔ آپؓ نے حرم کعبہ کی تعمیر کی۔ آپؓ قرآن کے بہت اچھے قاری تھے۔ آپؓ کو عبادات میں بھی بڑا انہماک تھا۔ آپؓ کی ذات میں دین اور دنیا دونوں کی صفات عالیہ کا اجتماع تھا۔ آپؓ کی تربیت حضرت زبیر بن عوامؓ جیسے والد اور عائشہ صدیقہؓ، جیسی خالہ کی آغوش محبت میں ہوئی تھی۔ آپؓ کی روایت کردہ تینتیس احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو متفق علیہ، چھ میں بخاری اور دو میں مسلم منفرد ہیں۔ بقیہ احادیث دوسری مجامع میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تھی کہ حرم شریف میں آپ کا قتل ہوگا۔ آپؓ کا شمار عبادلۂ اربعہ میں ہوتا ہے۔

خاتمۂ کلام

یوں تو صحابۂ کرام کے زمرہ میں ایک سے ایک بڑھ کر روشن ماہ وانجم ہیں، جن کا تعلق مہاجرین اور انصار دونوں سے ہے لیکن یہاں صحابۂ مہاجرین میں سے بیس نمایاں افراد کی مختصر سوانح حیات، ان کے کارناموں اور فضائل کا تذکرہ کیا گیا ہے تا کہ رسول ﷺ کے طریق دعوت کے نتیجے میں جو ٹیم تیار ہوئی اس کا ایک نمونہ سامنے آسکے۔ نبیوں کے علاوہ، جنھیں اللہ کی طرف سے عصمت کا تحفظ حاصل ہے کوئی شخص خواہ کتنا ہی بلند رتبہ ہو خطا اور نسیان سے مبرا نہیں۔ اصل نمونہ تو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے کیوں کہ وہ معصوم ہیں لیکن چوں کہ صحابۂ کرام اسی نور سے مستنیر تھے اس لیے ان کی پاک زندگیاں بھی ہمارے لیے قابل اقتدا نمونۂ عمل فراہم کرتی ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کا دور خلافت ہر قسم کے فتنہ و فساد سے پاک ہے اور تقریباً ساری فتوحات اسی مختصر دور میں حاصل ہوئی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت بارہ سال رہی۔ اس کا نصف اول اسلام کی فتوحات اور شوکت و نصرت کا اور بقیہ نصف حصہ لوگوں کی ناراضی اور فتنہ و فساد کا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت کی تھی کہ ان کے مقرر کردہ عمال کو ایک سال تک تبدیل نہ کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ نے اس پر عمل کیا۔ لیکن ایک سال کے بعد آپؓ نے، جو عمال مقرر کیے ان میں سے اکثر ان کے کنبے اور قبیلے کے تھے۔ ان کے پیش رو خلفاء نے اپنے اور اپنے اعزہ کے لیے کسی قسم کا نفع پسند نہیں کیا تھا یہاں تک کہ ان دونوں بزرگوں نے

حکومت سے ملنے والے وظیفے کی رقم بھی واپس کر دی تھی لیکن حضرت عثمانؓ عزیمت اور توکل کا یہ معیار برقرار نہیں رکھ سکے۔ حضرت عمرؓ نے صحابۂ کرام کو مدینہ سے باہر جانے کی ممانعت فرما دی تھی۔ یہ پابندی حضرت عثمانؓ نے اٹھا دی، جس کے نتیجے میں مختلف مقامات پر ان صحابہ کے الگ الگ حلقے پیدا ہو گئے، جس نے اختلافات کو راہ دی۔ حضرت عثمانؓ پر جو اعتراضات ہوئے وہ فقہی قسم کے تھے اور آپؓ نے ان کے مسکت جوابات بھی دیے، لیکن آپؓ کے بعض کام لوگوں کے نزدیک احتیاط اور تقویٰ کے منافی تھے۔ اس کے باوجود تمام اجلہ صحابہ کرام نے آپؓ کے قتل کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنی بے نفسی اور مدینۃ النبی کی بے حرمتی کے اندیشے سے خود ان کوششوں میں تعاون نہیں کیا۔ اس سے مسلمانوں میں باہمی جنگ وجدل کی بنیاد پڑ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان تمام فتنوں کی پیشگی خبر دے دی تھی۔ آپؐ کی پیشین گوئیوں میں حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت اور حضرت عائشہؓ کے خروج کا بھی ذکر ہے۔ دراصل حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں جنگ نہیں چاہتے تھے لیکن جمل، صفین اور نہروان کی جنگیں طالع آزماؤں اور خوارج کی سرکشی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئیں۔ حضرت علیؓ کے بعد حضرت حسنؓ پانچویں خلیفہ ہوئے لیکن اپنی صلح کل طبیعت کی وجہ سے آپؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ بگاڑ اب بھی نہ پیدا ہوتا اگر حضرت معاویہؓ لوگوں کے بہکاوے میں آ کر اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کی بیعت نہ لیتے۔ اس بیعت نے خلافت کی شاہ راہ ہی بدل دی اور اسے ملوکیت کی راہ پر گام زن کر دیا۔

یزید کے عہد حکومت میں خلافت کے دو اور دعوے دار پیدا ہوئے۔ حسین ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ۔ یہ دونوں بزرگ اہلیت اور اول الذکر رسول اللہ ﷺ سے حق قرابت کی بنا پر خلافت کے مدعی تھے۔ اس وقت صحابۂ کرامؓ میں تین گروہ تھے۔ ایک ان دونوں میں سے کسی نہ کسی کا طرف دار تھا۔ دوسرا ان دونوں بزرگوں کو یزید کے مقابلے میں زیادہ مستحق سمجھنے کے باوجود، خلافت قائم ہو جانے کے بعد خروج کو ناجائز سمجھتا تھا اور تیسرا گروہ فتنے سے الگ رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتا تھا۔ یزید کی حمایت میں دوسرے گروہ والے بھی شامل تھے۔ آخر کار معرکۂ کربلا اور واقعۂ حرہ کے وقت تمام لوگ ان دونوں کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ہم جیسے گنہگاروں کو ان پاک قدسی صفات لوگوں کے بارے میں لب کشائی کرنا زیب نہیں دیتا، لیکن

تاریخ نے جو بات رقم کی وہ یہی ہے کہ صحابۂ کرام کی جماعت، جس نے نصف دنیا پر اسلامی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے تھے، اسلامی حکومت کو خلافت سے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کو روک نہ سکی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحابۂ کرام کو مرکز خلافت میں انتشار پسند نہیں تھا اور یہی ان کا عذر ہے۔

یزید کے بعد یہ خلافت موروثی نہیں ہوئی کیوں کہ یزید کے فرزند، معاویہ ابن یزید نے اس ذمے داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس کے بعد خلافت بنوامیہ میں متوارث رہی، جنھوں نے بہ ہر حال خلافت اسلامیہ کی عربی شان برقرار رکھی۔ بنوامیہ ہی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے بزرگ خلیفہ ہوئے، جنھیں خلفائے راشدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن بنوامیہ کے زوال کے بعد جب شیعان علی کے توسط سے بنوعباس سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے بنوامیہ ہی نہیں بلکہ خانوادۂ علیؓ کو بھی نہیں بخشا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے دور میں عجمیت اور تشیع نے اپنی جگہ بنالی۔ یہاں تک کہ ایک شیعہ وزیر ابن علقمی کے ذریعے خلافت عباسیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ انھیں کے دور میں قرامطہ اور دوسرے بہت سے فتنوں کا ظہور ہوا، جنھوں نے اسلام کی نہ صرف صورت مسخ کی بلکہ اسے چیستان بنا کر رکھ دیا۔

خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کے باوجود، جو شان و شوکت عالم اسلام کی بنوامیہ کے زمانے میں تھی اور پھر اسی خاندان کے ایک شہزادے عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس میں، جو خلافت قائم کی وہ اسلام کا سنہرا دور کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

ہم ان بزرگوں کے معاملات کو اللہ ہی کے حوالے کرتے ہیں، کیوں کہ ہر ایک کا عذر اس کے ساتھ ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا
تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۴۱)

”یہ ایک امت تھی، جو گزر چکی، جو انھوں نے کیا ان کے لیے ہے اور جو تم نے کیا تمھارے لیے، تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ کیا جائے گا۔“

اجتماعی طریق کار

انبیائی طریق کار میں ابھی تک داخلی خصائص پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اب ان طریقوں کا ذکر ہوگا، جنھیں داعی اپنی ذات سے باہر اختیار کرتا ہے۔ ان خارجی طریقوں میں پہلی چیز ہجرت ہے۔

(۱) ہجرت

ہجرت کا لفظ ''ہجر'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں ''اللہ کے لیے ترک وطن کر دینا'' ہجرت کہلاتا ہے۔ (۶۹) اپنا وطن چھوڑ دینا بہت بڑے دل گردے کا کام ہے۔ دراصل یہ بہت بڑی قربانی ہے، جو آدمی کسی مقصد کے حصول کی خاطر دے سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے ہیں ''اسی بنا پر ہجرت ایک صادق الایمان اور مخلص مسلمان کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے بہترین ''کسوٹی'' اور ''معیار'' ہے۔ نیز فضاء روحانی کا ٹمپریچر معلوم کرنے کے لیے ''جہاد'' اور ''ہجرت'' ہی دو ''مقیاس الحرارت'' ہیں، جن سے مومنوں کے ایمان کی حرارت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔'' (۷۰)

رسول اکرم ﷺ نے ہجرت کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

عَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَ لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ، وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَءَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ. (۷۱)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو جزا اس کی نیت کے مطابق ملے گی۔ پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور رسولؐ کی طرف (یعنی اللہ اور رسولؐ کی خاطر) ہے اس کی ہجرت اللہ اور رسولؐ کے لیے مانی جائے گی اور اگر کسی کی ہجرت دنیا کے لیے ہے تو جزائے اعمال میں یہی مانا جائے گا، یا کسی کی ہجرت کسی (مخصوص) عورت سے شادی کی خاطر ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے مانی جائے گی۔''

اس حدیث نے یہ بات صاف کردی کہ ہجرت یا نقل مکانی میں نیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ انبیائے کرامؑ کے اسوہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہجرت اپنے ایمان کے تحفظ اور دین پر عمل کرنے کی آزادی کے لیے ہے۔ یہ ہجرت اس وقت فرض ہوجاتی ہے جب کسی جگہ کے لوگ ''مستضعفین فی الارض '' کے درجہ کو پہنچ گئے ہوں، الا یہ کہ ہجرت کے وسائل اور اسباب ہی میسر نہ ہوں۔ موجودہ دور میں قومی بنیادوں پر ممالک کی تقسیم اور آمد و رفت کی پابندیاں (Immigration Rules) شاید اللہ کے نزدیک عذرات میں شامل ہوں۔ ارشاد باری ہے:

اِنَّ الَّـذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ط قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا ط فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ط وَ سَآءَ تْ مَصِیْرًا o اِلَّا الْـمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لاَ یَسْتَـطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلاَ یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلاً o فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ ط وَکَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا o (النساء:۹۷-۹۹)

''جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کم زور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں، جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔ ہاں، جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کردے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔''

غیر نبی کی ہجرت

قرآن پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نبی اور غیر نبی کی ہجرت کے احکام میں فرق ہے۔ غیر نبی کے اوپر رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل صرف اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر وطن چھوڑنا ضروری تھا، جیسا کہ اصحاب کہف کی ہجرت سے ظاہر ہے:

اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْکَھْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۝ (الکہف:۱۰)

''جب وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے پروردگار! ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے۔''

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْھُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ فَاْوٗٓا اِلَی الْکَھْفِ یَنْشُرْ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَ یُھَیِّئْ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا۝

(الکہف:۱۶)

''اب جب کہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمھارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمھارے کام کے لیے سر و سامان مہیا کرے گا۔''

قَالُوْا رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ط فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ ھٰذِہٖٓ اِلَی الْمَدِیْنَةِ فَلْیَنْظُرْ اَیُّھَا اَزْکٰی طَعَامًا فَلْیَاْتِکُمْ بِرِزْقٍ مِّنْہُ وَلْیَتَلَطَّفْ وَلَا یُشْعِرَنَّ بِکُمْ اَحَدًا۝ اِنَّھُمْ اِنْ یَّظْھَرُوْا عَلَیْکُمْ یَرْجُمُوْکُمْ اَوْ یُعِیْدُوْکُمْ فِیْ مِلَّتِھِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا۝

(الکہف:۱۹،۲۰)

''پھر وہ بولے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی کو یہاں ہماری موجودگی کی خبر نہ دے بیٹھے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگ سار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے۔ اور اگر ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔''

اصحاب نبیؐ نے بھی دو بار حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ پہلی بار ۴ھ نبوی میں اور دوسری بار ۵ھ نبوی میں۔ (۷۲) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہجرت کی طرف واضح اشارہ ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ
اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر:۱۰)

''جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھائی کی، ان کے لیے اچھائی ہے اور اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

حافظ ابن کثیرؒ نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو عافیت سے دور اور ابتلا سے دوچار پایا، اور ان کے چچا ابوطالب بھی ان کی اعانت سے معذور تھے، تو آپ ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ کاش تم حبشہ کو ہجرت کر جاتے، کیوں کہ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے، جس کے یہاں ظلم نہیں ہوتا۔ اور وہ صدق کی سرزمین ہے، اس وقت تک کے لیے کہ اللہ تمھارے لیے کوئی راہ پیدا کر دے۔ پس اصحاب رسول ﷺ میں سے یہ مسلمان فتنہ کے خوف سے حبشہ کو ہجرت کر گئے۔ ان کا یہ فرار اللہ ہی کی طرف اور دین کی خاطر تھا۔ پس یہ اسلام میں اولین ہجرت تھی۔'' (۷۳)

واضح رہے کہ ہجرت حبشہ میں رسول اللہ ﷺ شامل نہیں تھے، مزید یہ کہ یہ ہجرت اس وقت واقع ہوئی جب اسلام اپنے تدریجی مراحل کی ابتدائی منزلوں میں تھا اور شریعت اسلامیہ کے بیشتر حصے کا نزول اور قیام نہیں ہوا تھا۔

نبی کی ہجرت

جب نبی کی حجت، اللہ کے نزدیک اس کے بندوں پر تمام ہو جاتی ہے تو اللہ اس قوم کی مہلت عمل ختم کر دیتا ہے اور اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ اہل ایمان کو لے کر ارض مغضوبہ سے ہجرت کر جائے۔ اس کے بعد عذاب الٰہی سے وہ قوم فنا کے گھاٹ اتار دی جاتی ہے۔ تاریخ انسانی کا سب سے پہلا عذاب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر آیا تھا۔ یہ عذاب طوفان باراں کی شکل میں تھا۔ (۷۴) نبی کے اتمام حجت کے بعد عذاب الٰہی کا نزول اللہ کی سنت رہی ہے۔ (۷۵) قوم نوحؑ کے بعد یہ عذاب قوم عاد (حضرت ہودؑ کی قوم)، (۷۶) قوم ثمود (حضرت صالحؑ کی قوم)، (۷۷) قوم سدوم وعمورہ (حضرت لوطؑ کی قوم) (۷۸) اور اصحاب مدین (حضرت شعیبؑ کی قوم) (۷۹) کے علاوہ کچھ دیگر قوموں کے اوپر بھی آیا تھا اور یہ قومیں نشان عبرت بنا دی گئی تھیں۔

صاحب شریعت رسول کی ہجرت

ہجرت کی یہ قسم نہایت درجہ اہمیت کی حامل ہے، کیوں کہ صاحب شریعت نبی (جنھیں رسول کہا جاتا ہے) اللہ کی طرف سے دین قائم کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے۔ مشہور انبیاء میں صاحبانِ شریعت حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مانا جاتا ہے۔ بائبل کے بیان کے مطابق دنیا کی موجودہ آبادی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی نسل سے ہے۔ سفر تکوین میں ہے "نوح کے بیٹے جو کشتی سے نکلے سام، حام اور یافث تھے۔ اور حام کنعان کا باپ تھا۔ یہی تینوں نوح کے بیٹے تھے اور ان ہی کی نسل ساری زمین پر پھیلی۔" (۸۰) اسلامی تاریخوں میں بھی سام، حام اور یافث کے نام سے حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں کا ذکر ہے۔ لیکن بائبل کی یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کے بیٹوں کے علاوہ اور مسلمان بھی کشتی میں سوار تھے سام، حام اور یافث ہی کی نسل کیوں روئے زمین پر پھیلی؟

مسلم علماء کی کتابوں میں حضرت نوح علیہ السلام کو پہلا صاحب شریعت نبی کہا گیا ہے، لیکن ان کی شریعت کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ اگر شریعت کی ابتدا حضرت نوحؑ سے مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک آخر کن احکام شریعت پر عمل ہوا ہے؟ لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی صاحب شریعت تھے۔ جنت میں شجر ممنوعہ کا پھل کھانا بھی تو شریعت کی خلاف ورزی ہی تھی۔

چوں کہ حضرت نوحؑ کی ہجرت کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، اس لیے یہ سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع کیا جاتا ہے۔

اصحابِ شریعت رسول

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے صرف کتاب ہی نہیں دی (۸۱) بلکہ کار نبوت کی انجام دہی اور اس کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے دو فرزند بھی عطا فرمائے۔ (۸۲) آپؑ نے دونوں بیٹوں کے لیے الگ الگ مرکز تبلیغ قائم کیا۔ (۸۳) بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

کے لیے مکہ میں خانۂ کعبہ کی بناڈالی اور اس کے چالیس سال بعد چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لیے یروشلم میں مسجد اقصیٰ تعمیر کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا۔(۸۴) جب آپ نے وہاں سے ہجرت کے لیے کمر کس لی تو فرمایا:

وَ قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ؀ (الصّٰفّٰت:۹۹)

''اس نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ وہی مجھے راستہ دکھائے گا۔''

چناں چہ وہاں سے آپ حاران ہوتے ہوئے پہلے کنعان (موجودہ فلسطین) گئے جہاں آپؑ نے بحکم خداوندی دو جگہ قربان گاہیں بنائیں۔(۸۵) اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے۔ یہ بات قرین عقل نہیں ہے کہ آپ نے مصر میں تبلیغ دین نہ کی ہو (بائبل کا بیان ہے کہ آپؑ قحط کی قہرمانیوں سے بچنے کے لیے مصر گئے تھے)۔ واپسی میں پہلے آپؑ بیت ایل آئے اور یہاں بھی ایک قربان گاہ بنائی، پھر حبرون میں مستقل قیام فرمایا۔(۸۷) یہیں آپ کو خواب میں صلبی بیٹے کی بشارت ہوئی اور بطور نشان پرندوں کے ذبح کا واقعہ پیش آیا۔(۸۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام پر کتاب کا نزول اور اللہ کے ساتھ معجزانہ قسم کی راز و نیاز کی وہی نوعیت ہے، جو تدریج شریعت کے تعلق سے نزول قرآن کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام تک نسلاً بعد نسلٍ جاری رہی ہے۔ قرآن کریم اس پر ناطق ہے:

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ؀ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؀ وَ وَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؀ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ (البقرہ:۱۳۰-۱۳۳)

''اب کون ہے، جو ابراہیم کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کرلیا ہو، اس کے سوا کون یہ حرکت کرسکتا ہے۔ ابراہیم تو وہ شخص ہے، جس کو ہم نے اپنے کام کے لیے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ مسلم ہو جا تو اس نے فوراً کہا کہ میں مالک کائنات کا 'مسلم' ہوگیا۔ اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا تھا کہ میرے بچو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا تم مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔ پھر کیا اس وقت تم موجود تھے جب یعقوبؑ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا، اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا، بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کروگے؟ ان سب نے جواب دیا کہ ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے، جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ نے خدا جانا ہے اور ہم اسی کے 'مسلم' ہیں۔''

ان آیات میں ''الٰہ''، ''رب''، ''دین'' اور ''عبادت'' کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ ان الفاظ سے وجود ''مسلم'' کا قوام تیار ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب کتاب اور صاحبِ شریعت پیغمبر تھے۔ ان کی اولاد کا عہد دراصل پورے دین کو قائم کرنے کا تھا، جس میں عقائد، عبادات، معاملات، حلت و حرمت، تعزیری قوانین اور قوانین حکومت بہ شمول صلح و جنگ شامل تھے۔ بائبل سفر پیدائش کی مختلف آیات میں، جو اشارے آئے ہیں، ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اقتضائے وقت کے تحت اللہ نے، جو شریعت مناسب سمجھی حضرت ابراہیمؑ کے اوپر نازل فرمائی۔ اس شریعت پر آپ کی پوری قلمرو میں عمل ہوتا رہا۔ پھر اللہ کی مشیت ہوئی کہ نفاذ شریعت کی توسیع کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر بھیجا جائے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام

اس بات کی تاریخی اور اثری تحقیق کی ضرورت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ کے بعد مصر میں اسلام کا چرچا کب تک رہا۔ کیوں کہ بائبل اس باب میں بالکل خاموش ہے۔ اور

قرآن میں حضرت یوسفؑ کا جو قصہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مصر پہنچنے تک حکومت اور پورے معاشرے کا نظام طاغوتی اور اباحیت زدہ ہو چکا تھا۔ حضرت یوسفؑ اگرچہ صاحب کتاب نبی نہیں تھے لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام سے ان کے بیٹوں نے جو وعدہ کیا تھا اس کی رو سے وہ اپنے باپ اور خاندان کی مفوضہ دعوت توحید کو جہاں تک ان کا بس ہوتا پہنچانے پر مامور تھے۔ دوسرے گیارہ بھائیوں کے مقابلے میں اللہ نے حضرت یوسفؑ کو نبوت سے سرفراز فرمایا، (۸۹) کیوں کہ آپ کے ذریعے مصر میں قانون الٰہی کا نافذ کیا جانا مقصود تھا۔ رفیقان زنداں سے خطاب کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیۡ رَبِّیۡ ؕ (یوسف:۳۷)

''یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔''

چناں چہ فیض نبوت کے حصول کے ساتھ ہی آپ جیل کے دونوں ساتھیوں کو اسلام کی طرف بلانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ (۹۰) پھر جب آپ شاہی محل پہنچتے ہیں تو آپؐ کی دیانت داری اور معاملہ فہمی سے متاثر ہو کر فرعون حکومت کے تمام اختیارات آپ کے سپرد کر دیتا ہے:

''سو تو میرے گھر کا مختار ہوگا۔ اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔ اور فرعون نے یوسفؑ سے کہا کہ دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں۔ اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسفؑ کے ہاتھ میں پہنا دی۔'' (۹۱)

''اور فرعون نے یوسفؑ سے کہا میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔'' (۹۲)

یوسف علیہ السلام نے جو زرعی قانون رائج کیا وہ بائبل کے الفاظ میں اس طرح ہے:

''اور یوسفؑ نے یہ آئین جو آج تک ہے مصری زمین کے لیے ٹھیرایا کہ فرعون پیداوار کا پانچواں حصہ لیا کرے۔'' (۹۳)

اسلام نے بھی بارانی زمین کی زکوٰۃ ۵/۱ رکھی ہے۔ (۹۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکی معاملات میں حضرت یوسف علیہ السلام نے شریعت ابراہیمی کو رائج کر دیا تھا۔ تعزیری قوانین کی ترویج پر خود قرآن شاہد ہے۔ جب شاہی پیالہ کی چوری کا معاملہ سامنے آیا تو تفتیشی افسران

نے برادران یوسف ہی سے پوچھا کہ چوری کی سزا شریعت ابراہیمی میں کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا:

جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ (یوسف:۷۵)

''اس کی سزا یہی ہے کہ جس کے اسباب میں (سامانِ مسروقہ) پایا جائے وہی اس کا بدلہ ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام صاحب شریعت نہیں تھے لیکن قحط سالی کے ابتدائی زمانے میں جب انتظام ملکی یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں میں آیا تو آپؑ کو یہ موقع حاصل ہوا کہ شریعت ابراہیمی نافذ کریں اور نبی ہونے کی وجہ سے اللہ نے خود یہ موقع فراہم کیا کہ اس نفاذ کی ابتدا وہ اپنی ذات سے کریں۔ غور فرمائیے، اللہ کہتا ہے:

مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ (یوسف:۷۶)

''اس کے لیے سزاوار نہیں تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) کے مطابق اپنے بھائی کو پکڑتا۔''

یہیں سے لفظ ''دین'' کے معنی میں یہ وسعت بھی سامنے آتی ہے کہ ملکی قانون اور تعزیری قوانین دین میں شامل ہیں۔ دین کو عبادات یا کچھ معاملات اور محاسن اخلاق تک محدود رکھنے والوں کو قرآن کی اس تشریح پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ یوسف علیہ السلام اور ان کی اولاد و احفاد کی تبلیغی کوششوں کا مزید ثبوت مصر میں بنی اسرائیل کی تعداد ہے۔

بائبل کا بیان ہے:

''یعقوبؑ کے صلب سے، جو لوگ پیدا ہوئے اور اس کے ساتھ مصر میں آئے وہ اس کی بہوؤں کو چھوڑ کر شمار میں چھیاسٹھ (۶۶) تھے اور یوسفؑ کے دو بیٹے تھے، جو مصر میں پیدا ہوئے۔ سو یعقوب کے گھرانے کے جو لوگ مصر میں آئے وہ سب مل کر ستر ہوئے۔'' (۹۵)

لیکن جب مصر سے نکلے ہیں تو: ''اور بنی اسرائیل نے رعمسیس سے سکات تک پیدل سفر کیا اور بال بچوں کو چھوڑ کر وہ کوئی چھ لاکھ مرد تھے اور ان کے ساتھ ایک ملی جلی گروہ بھی گئی۔'' (۹۶)

اور بنی اسرائیل کا قیام بائبل ہی کے مطابق چار سو تیس برس تھا:

’’اور چار سوتیس برسوں کے گزر جانے پر ٹھیک اسی روز خداوند کا سارا لشکر ملک مصر سے نکل گیا۔‘‘(۹۷)

بائبل کی ان آیتوں کے پیش کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ چار سوتیس سالوں میں ستر کی تعداد کا بڑھ کر چھ لاکھ پہنچ جانا بلا تبلیغ کے ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ بعد کی آیت میں اس تعداد کو بنی اسرائیل نہیں بلکہ ’’خداوند کا سارا لشکر‘‘ کہا گیا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت تھی کہ جب تک اس کی مرضی ہو مصر میں دین کا علم بلند رہے اور جب اس کے امکانات معدوم ہو جائیں تو اللہ پھر اپنے نبی کو ہجرت کا حکم دے تا کہ ایک نئی سرزمین پر اللہ کا دین قائم کیا جا سکے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر بھیجنے کا مقصد جب تک اللہ کی مرضی رہی، پورا ہوا اور جب وہاں کی سرزمین اسلام کی نشو و نما کے لیے شور ہو گئی تو اللہ نے دوسرے برگزیدہ نبی اور رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر چھوڑ کر دوبارہ ان کے آبائی وطن فلسطین ہجرت کر جانے کا حکم دیا تا کہ وہ اس دین کا علم وہاں نصب کر سکیں۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم کی سینتیس (۳۷) سورتوں کی پانچ سو چودہ (۵۱۴) آیتوں میں کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کو اللہ نے امت مسلمہ کے لیے نشان عبرت بنایا ہے اور قرآن میں کسی اور نبی کا اتنا مفصل تذکرہ نہیں ہے۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا ذکر خصوصیت سے یہودیوں کی ترغیب و ترہیب کے لیے ہے۔ یہ تاریخ نہیں ہے اس لیے ہم ترتیب واقعات کے لیے بائبل ہی کے بیان سے استفادہ کریں گے۔

قیام بنی اسرائیل کے چار سو سالوں میں مصر میں کئی حکمراں خاندان تبدیل ہوئے۔(۹۸) مسلمانوں کی تعداد کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے ان بادشاہوں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ دشمنوں سے نہ مل جائیں یا زبردستی ہجرت کر جائیں (۹۹) اس لیے کارِ دعوت کے ختم ہو جانے کے بعد ان حکمرانوں نے آہستہ آہستہ بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لیا۔ اہرام مصر، ابوالہول اور ابوسمبل، جیسی محیر العقول تعمیرات اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صاحبِ شریعت نبی بنایا۔ شریعت کے نفاذ کے لیے ایک آزاد ملک کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اس ملک کے حصول کے لیے اللہ نے بہ تدریج اپنے نبی کو تیار کیا۔ سب سے پہلے مدین سے واپسی

پر آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اور معجزے عطا کیے گئے۔(۱۰۰) پھر اللہ نے دشمن خدا فرعون کو اس کے لاؤلشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا۔(۱۰۱) اس کے بعد جب آپ کوہ سینا پر چالیس دنوں کے لیے تشریف لے گئے تو اللہ نے آپؑ کو توریت عطا فرمائی۔(۱۰۲)

بائبل میں سب سے پہلا حکم جو بیان ہوا ہے وہ اس طرح ہے:

''میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا، تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا، جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے (مجسمہ سازی اور جاندار کی تصویر کشی تمام الٰہی شریعتوں میں حرام رہی ہے)۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا، نہ ان کی عبادت کرنا، کیوں کہ میں خداوند تیرا خدا غیور ہوں۔''(۱۰۳)

توحید کی تعلیم کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، جو شریعت دی گئی اس کی تفصیلات توریت کے اسفار، خروج، احبار، گنتی اور استثنا میں تکرار کے ساتھ موجود ہیں۔ تحریف کے باوجود توریت کے بہت سے احکام شریعت محمدی کے مماثل ہیں۔ قصاص کے معاملے میں تو قرآن نے توریت ہی کے حکم کو باقی رکھا ہے۔(۱۰۴) قتل مرتد کی سزا، جس کا حکم بائبل نے صریح الفاظ میں دیا ہے(۱۰۵) شریعت اسلامیہ میں احادیث سے ثابت ہے۔(۱۰۶)

بنی اسرائیل کی مسلسل سرکشی کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں فلسطین نہیں پہنچ سکے اور دشت تیہ کی چالیس سالہ صحرا نوردی کے دوران ہی کوہ موآب پر آپ کی وفات ہو گئی۔(۱۰۷) جانشین موسیٰؑ یوشع بن نونؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے، (۱۰۸) اس طرح حضرت یوشع علیہ السلام کے ذریعے فلسطین میں دین قائم ہوا!۔(۱۰۹)

بنی اسرائیل میں حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دو انبیاء صاحبان کتاب تھے لیکن دونوں صاحبان شریعت نہیں تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ نے زبور نازل فرمائی تھی۔ موجودہ زبور، جو بائبل کے عہد نامہ عتیق میں شامل ہے ایک سو پچاس (۱۵۰) نعتوں (مزامیر) کا مجموعہ ہے۔ اس کے آخری سے پہلے مزمور میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔(۱۱۰) اسی طرح تصویر کشی اور بت تراشی بھی، جس کی حرمت بائبل میں ہے، اسلام میں بالکل حرام ہے۔

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت شان تمام ایمان والوں کے نزدیک مسلم ہے۔ آپ بنی اسرائیل میں بہ حیثیت ایک مصلح قوم کے مبعوث کیے گئے تھے لیکن آپؑ کی بعثت اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی آمد کی بشارت کے لیے بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰۃِ وَ مُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ ؕ (الصّف:۶)

''اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا اس توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے۔ اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، اور جس کا نام احمد ہوگا۔''

انجیل یوحنا میں ہے:

''جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی (آں حضرتؐ) ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔...... تمھارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے یعنی میرے بعد کا آنے والا، جس کی جوتی کا تسمہ میں کھولنے کے لائق نہیں۔'' (۱۱۱)

مکاشفات یوحنا میں یہ بشارت زیادہ واضح ہے:

''پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے، جو سچا اور برحق کہلاتا ہے اور وہ راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے...... اور اس کی پوشاک اور ران پر یہ نام لکھا ہوا ہے، بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند۔'' (۱۱۲)

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور حضرت داؤد علیہ السلام دونوں نے حضور اکرم ﷺ کے آنے کی خوش خبری لوگوں کو سنائی ہے۔ انھوں نے دین حق کو برپا کرنے کے لیے کوئی ہجرت نہیں کی۔ ان کی پیغمبرانہ مساعی شریعت موسوی کے تحت اور اسی کے قیام کی خاطر تھی۔ یہ

یہودیوں کی بدقسمتی ہے کہ انھوں نے حضرت داؤدؑ کو صرف بادشاہ تسلیم کیا تاکہ قیام دین میں ان کی مساعی کو بے وزن کر دیا جائے اور حضرت عیسیٰؑ کا انکار کر کے انھیں بزعم خود سولی پر چڑھا دیا تاکہ ان کی بعثت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ عیسائیوں نے مزید ستم کیا کہ حضرت داؤدؑ کی یہودیوں کی دی ہوئی حیثیت تو قبول کر لی لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا لیا۔ اس طرح ان پیغمبروں کے مقصدِ بعثت کا انکار کر کے دونوں راندۂ درگاہ ہو گئے۔ ہجرت کے ذیل میں ان دونوں کا تذکرہ فقط ان کے صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔

(۵) حضرت محمد رسول اللہ ﷺ

حضور اکرم ﷺ کی نبوت دیگر پیش رو انبیاء کے لیے نبی منتظر کی تھی۔ آپؐ دعائے خلیل اور نوید مسیحا تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کی معیت میں خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت دعا فرمائی تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (البقرہ:۱۲۹)

''یارب! ان لوگوں میں خود انھیں کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو، جو انھیں تیری آیات سنائے۔ ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔''

بنی اسرائیل میں حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ خود حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ ایک جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

''خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا۔'' دو آیتوں کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے: ''میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو، جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔'' (۱۱۳) مزید آگے ارشاد ہوتا ہے

”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ وہ لاکھوں قدوسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشیں شریعت تھی۔“ (۱۱۴)

الہامی مذاہب میں صرف یہودیت اور اسلام دو ہی مذاہب ہیں، جن کی شریعت موجود ہے۔ یہودی شریعت آفات زمانہ اور خود اپنوں کی دست برد کی وجہ سے محرف ہو چکی ہے، لیکن اسلامی شریعت کا چشمۂ صافی بحمد اللہ ہر قسم کی آلائشوں اور ترکتازیوں سے محفوظ ہے۔ یہودی شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بہ تمام وکمال نافذ نہ ہو سکی۔ ان کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام نے فلسطین پہنچ کر اسے نافذ کرنے کی کوشش کی، لیکن بنی اسرائیل کی سرکشی ہمیشہ آڑے آتی رہی۔ اقامت دین کا کام سازگار ماحول کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔ یہ ماحول یہودی شریعت کو کم ہی میسر آیا۔ لیکن نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے لیے مدینہ کی ہجرت نے حالات کو اس قدر سازگار بنا دیا کہ صرف دس سالوں میں اسلام بہ تمام وکمال پوری اسلامی مملکت کا دین ہو گیا۔

کیا ہجرت کا حکم اب بھی باقی ہے؟

کیا ہجرت کا حکم اب بھی باقی ہے؟ اگر ہجرت کرے تو آدمی کہاں جائے؟ پوری دنیا میں ملکوں کی، جو قومی اور نسلی تقسیم ہو چکی ہے اور جس کی بنا پر نئے نئے ممالک وجود میں آ چکے ہیں اور جنھیں بین الاقوامی پیمانے پر تسلیم بھی کر لیا گیا ہے، اس کی رو سے اب بین ملکی ہجرت کے لیے زمین تنگ ہو چکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے یہ ہے کہ آدمی اپنے ہی ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں ہجرت کر جائے بہ شرطے کہ وہاں کے حالات سازگار ہوں۔ لیکن یہ ہجرت اصحاب کہف کی طرح صرف ایمان کے تحفظ کی خاطر ہو گی۔ دین کے قیام کے لیے ہجرت بہ ظاہر اب ناممکنات میں سے ہے۔ پچھلی صدی میں ایمان کے تحفظ کی خاطر روسی ترکستان کے مسلمانوں نے ہجرت کی تھی۔ بیسویں صدی کے وسط میں برصغیر کے وسط سے مشرق اور مغرب (موجودہ بنگلہ دیش اور پاکستان) کی طرف دین کے قیام کی خاطر مسلمانوں نے ہجرت کی تھی۔ ان دونوں ہجرتوں سے دین کے معاملے انھیں کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ زین جیانگ اور روسی ترکستان کی آزاد شدہ مسلم ریاستوں اور قفقاز میں مسلمان عقائد اور عبادات کے جبر کا شکار ہیں۔ مشرق بعید کی بھی یہی صورت حال ہے۔ میانمار، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ کے علاوہ فلپائن اور افریقہ کے بعض علاقوں کے مسلمان عرصۂ دراز سے حکمراں طبقے کے ظلم اور چیرہ دستیوں کے نرغے میں ہیں۔ یورپ اور امریکہ جو آزادیِ رائے کے سب سے بڑے چیمپین بنتے ہیں اب اسلام کی

مخالفت میں کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ ہندستان میں جو ماحول پیدا کیا جا رہا ہے اور دستور اور قانون کی، جو تشریح کی جا رہی ہے اس سے تمام اقلیتیں خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ ان حالات میں ہجرت کے حکم کے روبہ عمل ہونے کا بہ ظاہر کوئی جواز نہیں نظر آتا۔ پھر مسلمان کیا کریں، اس پر ان شاء اللہ باب سوم میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

(۲) جہاد

انبیاے کرام کی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب انھیں دین کے قیام و بقا اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ انبیاء کی سیرت میں بالعموم یہ مرحلہ ہجرت کے بعد پیش آتا ہے۔ لیکن جب اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام، جیسے نبی کو جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ (البقرہ: ۲۵) نبی کریم ﷺ کو جہاد کی اجازت مدینہ میں ہجرت کے بعد ۲ھ میں دی گئی اور فرمایا گیا:

> اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ ۝ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ (الحج: ۳۹، ۴۰)

> ''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو، جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: ہمارا رب اللہ ہے۔''

کفار سے سابقہ انبیائے سابقین کو بھی پیش آیا ہے۔ فلسطین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مڈبھیڑ قبائلیوں سے مسلسل رہی ہے یہاں تک یہ سلسلہ حضرت یعقوب علیہ السلام تک دراز ہوا ہے۔ خروج مصر کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام نے فلسطین کو فتح کیا تو اس کے بعد کی پوری تاریخ ایک مسلسل جنگ نامہ ہے۔ واضح رہے کہ علماء یہود نے بائبل میں اپنی، جو تاریخ مرتب کی ہے اس میں ان کی جنگوں کا مقصد فقط ارضی حکومت اور دنیوی شوکت کا حصول رہا ہے۔ جہادِ قرآنی کا مقصد سمجھنے والوں کو اس ضمن میں بائبل کا مطالعہ کرکے بڑی مایوسی ہوگی، تاہم دل چسپی رکھنے والوں کو کتب خمسہ کے بعد بائبل کے، جو اسفار ہیں ان کا مطالعہ بڑا چشم کشا ہوگا۔ دنیوی اقتدار کی یہ جنگیں آج بھی لڑی جا رہی ہیں۔ مقصد میں کوئی

فرق آج تک نہیں آیا۔ دراصل جہاد اسلامی اور اقتدار کی جنگوں میں یہی فرق ہے۔ یہ جنگیں دینی جنگوں کا بدل نہیں ہو سکتیں۔

اسلام نے جنگ کو آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کیا اور اسے قتال فی سبیل اللہ کا مقدس نام دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قیام مدینہ کے دس سالوں میں، جن جنگوں میں آپؐ نے شرکت فرمائی (یعنی غزوات) اور جن جنگوں میں آپؐ نے شرکت نہیں فرمائی (یعنی سرایا) ان سب کی تعداد قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی تحقیق کے مطابق بیاسی (۸۲) ہے، جن میں مسلمان اور کافر مقتولین کی تعداد بالترتیب ۲۵۹ اور ۷۵۹ اور اسیروں کی تعداد بالترتیب ۱۱ اور ۶۵۶۴ ہے۔ ابن ہشام نے تو تمام مقتولین کے نام تک گنوائے ہیں۔ قاضی صاحب کے نزدیک اسلامی جنگیں صرف دفاعی ہوا کرتی تھیں۔ اسلام نے جنگ وصلح کے لیے ایک ایسا ضابطہ دیا ہے، جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی باہمی جنگیں اور وہ جنگیں، جو ان کی غیر مسلموں کے ساتھ ہوئیں، اگرچہ ان میں اسلامی آداب صلح وجنگ کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے، پھر بھی ان کی حیثیت ان جنگوں کے مقابلے میں، جو خدا بیزار طاقتوں کے درمیان آپس میں یا مسلمانوں کے ساتھ ہوئیں کوئی نسبت نہیں ہے۔ گزشتہ سو سالوں میں دنیا میں دو عظیم جنگوں کے علاوہ بھی مسلسل جنگیں ہوتی رہی ہیں، جن میں خاص طور سے مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان جنگوں کے دوران اور مابعد ترقی یافتہ اور بزعم خود تہذیب کی علم بردار طاقتوں نے انسانیت پر، جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی نظیر سوائے دور بربریت کے اور کبھی نہ ملے گی۔ اسلام صرف اعلائے کلمۃ الحق اور انسانیت کی امداد کے لیے جہاد کو فرض قرار دیتا ہے۔

جہاد کا موضوع آج کے دور کی خاص ضرورت ہونے کی وجہ سے انتہائی اہم ہو گیا ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں، جو تشریح طلب ہیں۔ اس لیے اس موضوع پر ''مدینہ کی اسلامی ریاست کے تحفظ و بقا میں جہاد کا کردار'' کے زیر عنوان تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن آج کل پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نئے نئے، جو طریقے اپنائے جا رہے ہیں ان سے نپٹنے کے لیے ایک نئے طریق کار (Strategy) کی ضرورت ہے۔

...

باب سوم

اقامت دین

اس حصے میں اس بات پر گفتگو کی جائے گی کہ انبیاء کا کام کیا رہا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے کس کام پر مامور کیے گئے تھے۔

دین کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو کس قدر اور کس طرح نافذ کیا، یہی جاننا ہماری اس تحریر کا مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ (الشوریٰ:۱۳)

''اس نے تمھارے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ!) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکوں کو سخت ناگوار ہوئی ہے، جس کی طرف (اے نبیؐ!) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔''

دین کی تعریف

اس آیت میں اقامت کے لیے ''دین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ قرآن ہی سے معلوم کیا جائے کہ دین کیا ہے۔

(۱) اسلام ایک دین ہے

اللہ تعالیٰ نے خود اسلام کو دین قرار دیا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ﻗﻒ (آل عمران:۱۹)

''اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔''

اور اسے اپنا پسندیدہ دین ٹھیرایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (المائدہ:۵)

''اور تمھارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا۔''

اور یہی دین اللہ کے یہاں مقبول ہے۔ کسی اور دین کی اللہ کے یہاں پذیرائی نہیں۔ فرمان باری ہے:

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ج وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (آل عمران:۸۵)

''اسلام کے علاوہ کوئی شخص اگر دوسرا دین پسند کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہوگا اور وہ شخص آخرت میں خسارے میں رہے گا۔''

اسی لیے اللہ کا واضح حکم ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ص (البقرہ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

(۲) عقائد، دین کے اجزائے ترکیبی ہیں

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ﻗﻠﮯ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ج فَمَنْ یَّكْفُرْ

بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى
لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ:۲۵۶)

''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے ایمان لے آیا اس نے ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔''

قیامت کے لیے لفظ دین کا استعمال

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (الشعراء:۸۲)

''اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ بہ روز جزا وہ میری مغفرت فرمائے گا۔''

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (الفاتحہ:۴)

''روز جزا کا مالک۔''

رسالت کے لیے لفظ دین کا استعمال

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ
سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ
وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ
وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ (النساء:۴۶)

''جن لوگوں نے یہودیت کا طریقہ اختیار کیا ہے ان میں کچھ لوگ ہیں، جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر دیتے ہیں، اور دین حق کے ساتھ نیش زنی کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر کہتے ہیں 'سمعنا و عصینا' اور 'اسمع غیر مسمع' اور 'راعنا'۔حالاں کہ اگر وہ کہتے 'سمعنا و اطعنا' اور 'اسمع' اور 'انظرنا' تو یہ انھیں کے لیے بہتر تھا اور زیادہ راست بازی کا طریقہ تھا۔''

اگر غور کیا جائے تو اس آیت میں لفظ ''دین'' واضح طور سے ''ایمان بالرسالت'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔

(۳) اخلاص دین ہے

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ

(البینہ:۵)

''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔''

(۴) عبادات دین ہیں

وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

(البینہ:۵)

''اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔''

یہاں نماز اور زکوٰۃ کو دین میں شمار کر کے گویا بتلا دیا گیا کہ تمام عبادات دین ہیں۔

(۵) طریق زندگی کا نام دین ہے

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران:۸۳)

''اب کیا یہ لوگ اللہ کے طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالاں کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چاروناچار اللہ ہی کے تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔''

(۶) حلت وحرمت کا پورا قانون دین ہے

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ

تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ط ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط (المائدہ:۳)

''تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور، جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر مخصوص کیا گیا ہو، وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا ہو۔ نیز یہ بھی تمھارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب افعال فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔''

اس آیت میں اشیائے خوردنی کی ظاہری و باطنی نجاست کی بنا پر حلت و حرمت کا قانون بیان ہوا ہے اور اسے ''دین'' کہا گیا ہے۔ پانسوں کے تیر کا ذکر کر کے اس دائرے کو پوری زندگی میں وسعت دے دی گئی ہے۔

(۷) حدود و تعزیرات بھی دین ہیں

ارشاد باری ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ص وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ج وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ٥

(النور:۲)

''زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کو سزا دیتے وقت چاہیے کہ اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔''

اس آیت میں زنا کی تعزیر کو ''دین'' قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح اسلامی حدود و تعزیرات کے تمام قوانین دین میں شامل ہو جاتے ہیں۔

(۸) دین بہ معنی قانون ملکی

مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ (یوسف:۷۶)

"(یوسف) اپنے بھائی کو بادشاہ (مصر) کے قانون کے لحاظ سے اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔"

مصری قانون میں چوری کی سزا غلامی نہیں بلکہ تازیانہ تھی، جب کہ اسرائیلی شریعت میں اس کی سزا (تقریباً) غلامی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو چوں کہ قانون مصر کے بہ جائے اسرائیلی قانون پر عمل کرنا تھا اس لیے اتمام حجت کے لیے انھوں نے خود اپنے بھائیوں ہی سے چوری کی سزا دریافت کی۔ چوں کہ شاہی پیالہ بنیامین کی خرجین سے برآمد ہوا تھا اس لیے ان کے بتلانے پر حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی بنیامین کو سزا کے طور پر اپنے پاس روک لیا۔ اس آیت میں اللہ نے مصری قانون کو دین سے تعبیر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تمام ملکی قوانین دین ہیں۔

(۹) دین پوری زندگی پر حاوی ہے

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○ (الانعام:۱۶۱)

"اے نبیؐ! کہو، میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین، جس میں کوئی کجی نہیں، ابراہیمؑ کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔"

رسولؐ سے کہا جا رہا ہے کہ اقرار کیجیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح پوری زندگی آپؐ اللہ کے تابع فرمان رہیں گے۔ اسی لیے مسلمانوں کو بھی اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (دین میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کا حکم دیا گیا ہے۔

اقامت دین کے اجزائے ترکیبی

اقامت دین کا مطلب ہے اس دین کو جسے قرآن میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے مکمل طور سے روئے زمین پر نافذ کرنا۔ انبیاء اسی کام کے لیے مبعوث کیے جاتے رہے تھے اور یہی

فریضہ اب اس امت کے اوپر اجتماعی طور سے عائد ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ (الشوریٰ:۱۳)

''اس نے تمھارے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ''

لیکن اب مسلمانوں کے حالات دنیا کے مختلف ممالک میں یکساں نہیں ہیں، اس لیے ایک مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے الگ الگ حالات میں الگ الگ طریقہ اور الگ الگ تدریج اختیار کرنی ہوگی۔ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ انبیاء کا اولین کام شرک کا قلع قمع کرنا رہا ہے، اور اصلاً وہ توحید کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ غیر صاحبان شریعت انبیاء نے یا تو فقط توحید کی دعوت دی ہے یا مکلّف ہونے کے باوجود اقامت دین کا کام ایک دن بھی نہیں کر سکے ہیں کیوں کہ اس کا انھیں موقع نہیں مل سکا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اس لیے امت مسلمہ اس روئے زمین پر جہاں جہاں ہے اولین مرحلے میں شرک کے انکار اور توحید کی دعوت دینے پر مامور ہے۔ (واضح رہے کہ اس دعوت کے مقتضیات میں فضیلت اخلاق کی دعوت شامل ہے)۔ دینی جماعتوں کی بھی اصل بنیاد توحید ہے۔ اگر توحید کا آئینہ دھندلا ہے تو اس میں دین کی کوئی تصویر نہیں ابھر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے قیام کے لیے اس کے اجزاء کی جو تفصیل بتلائی ہے، انھیں مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) اصلاح عقائد

مسلمانوں کے لیے کاموں کی مطلوبہ فہرست میں سب سے پہلا نمبر عقائد کی اصلاح ہے، کیوں کہ یہی دین کی اصل بنیاد ہے۔ اسی کو کلمۂ شہادت کہا جاتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت کی ابتدا اسی کام سے کی تھی۔ غیر مسلموں کو تو چھوڑیے خود مسلمانوں میں شرک کی

بہت سی اقسام اور طرح طرح کی بدعتیں رائج ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا توحید کا عقیدہ بہت کم زور ہو چکا ہے۔توحید کا اقرار قلب سے بھی ہے اور زبان سے بھی۔

(۲) عبادات

کلمۂ توحید کا اقرار کرنے کے بعد جو کہ دین کی اولین بنیاد ہے، دوسری بنیادوں پر توجہ دینی ضروری ہے۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔(۱۱۵) کلمۂ شہادت، نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ۔عبادات کا شمار حقوق اللہ میں ہوتا ہے۔اس کو ''تعبدی احکام'' بھی کہا جاتا ہے۔عبادات کا اہتمام کیے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا ہی بڑے جسارت کی بات ہے۔پھر جو لوگ دعوت دین کا کام کرنے والے ہوں، انھیں تو فرائض کے علاوہ عبادات نافلہ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

دین کی تشریح کے ذیل میں یہ بات بتلائی جا چکی ہے کہ عقائد اور عبادات، دین میں داخل ہیں، جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۵ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ ۝

(البینۃ:۵)

''انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یک سو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں، اور یہی ہے سیدھا دین۔''

اس آیت میں لفظ ''مخلصین'' خلوص عقیدہ کے لیے استعمال ہوا ہے، اور اقامت صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ سے مراد نظام عبادت کا قیام ہے۔

(۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو خیر امت کا خطاب دیا ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

(آل عمران:۱۱۰)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انھیں کے حق میں بہتر تھا۔ اگر چہ ان میں کچھ لوگ ایمان دار پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔''

یہ فریضہ تو دراصل پوری امت کے اوپر عائد ہے لیکن وہ لوگ اس کے خصوصی مکلّف ہیں، جو دعوت دین کا کام کرتے ہوں۔ اس آیت سے کچھ پہلے ہی حکم ہوا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(آل عمران:۱۰۴)

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی ہونے چاہئیں، جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔''

اوامر و نواہی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کو آفاقی قدروں (Universal Values) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام انسانوں کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اگر چہ یہ امر یہاں بھی اختلافی ہے کہ کسی شے کی کون سی مقدار معروف کی تعریف میں اور کون سی مقدار منکر کی تعریف میں آئے گی۔ پھر یہ کہ منکر کی کتنی مقدار کسی قانون کے تحت قابل انعام یا قابل تعزیر و عقوبت ہوگی۔ جیسے جھوٹ، سچ، چوری، زنا وغیرہ۔ دوسری قسم معروف اور منکر کی وہ ہے، جس کو روبہ عمل لانے کے لیے اسلام کی قوت نافذہ درکار ہے، اگر چہ ان کی حقیقت سے موجودہ دنیا بھی منکر نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سی چیزیں اب مغربی تہذیب میں داخل ہو چکی ہیں، جیسے شراب، جوا، سود، اکل حرام اور بے حیائی و فحاشی وغیرہ۔

اہل ایمان اور خصوصیت کے ساتھ دین کے داعیوں کا یہ کام یقیناً ہے کہ لوگوں میں حق و باطل اور معروف و منکر میں تمیز، خیر کو اختیار اور شر کو چھوڑنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ مسلمانوں کو تو

سیدھے سیدھے اللہ سے ڈرایا جا سکتا ہے، لیکن برادران قوم کو دنیوی نقصانات کے ساتھ جواب دہی کا احساس دلانا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ عقیدہ مسئولیت ایسا مبنی بر عقل عقیدہ ہے کہ کتنے ہی لوگ اس کی معقولیت کی وجہ سے آغوش اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور جن لوگوں کو دولت ایمان نصیب نہیں ہو سکی وہ بھی کم از کم اس عقیدے کو مبنی بر عقل سمجھتے ہیں۔

(۴) شہادت حق

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بشیر اور نذیر کے علاوہ ''شاہد'' بنا کر بھیجا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ○ (الاحزاب:۴۵،۴۶)

''اے نبیؐ! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔''

یہ ایک بہت بڑی ذمے داری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر ڈالی ہے کہ اس کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا جائے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں اللہ تعالیٰ کا قانون دو طرح سے عمل کرتا ہے ایک تکوینی طور سے، دوسرے تشریعی طور سے۔ قانون طبیعی ہی دراصل قانون تکوینی سے عبارت ہے۔ تمام مظاہر فطرت، چاند، سورج، ستارے، دن اور رات کا تغیر، سبھی اللہ کے وجود پر دلیل ہیں:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (البقرہ:۱۶۴)

''جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں، جو انسان کے نفع کی

چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں، جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے، اور اپنے اسی انتظام کی بہ دولت زمین میں ہر قسم کی جان دار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں، جو آسمانوں اور زمین کے تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔"

وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ (یٰس ۳۶: ۳۷-۴۰)

"ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے۔ ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور چاند، ہم نے اس کے لیے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔"

دوسرا قانون تشریعی ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو پیدا فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝ (الذاریات: ۵۶)

"میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔"

ان مکلّف مخلوقات کی رہ نمائی کے لیے اللہ نے دو انتظامات فرمائے۔ ایک یہ کہ انسانوں میں اس نے انبیاء علیہم السلام کا عظیم الشان سلسلہ جاری فرمایا:

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد: ۷)

"تم تو محض خبردار کرنے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک رہ نما ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا:

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ○ (فاطر:۲۴)

''اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے، جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔''

دوسرا انتظام اس نے اس کے نفس ہی میں فرمایا، اور اس کی اہمیت پر اس نے قسم کھائی:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○

(القیٰمۃ:۱،۲)

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔''

اس نفس کی، جسے اللہ نے ''لوّامہ'' کا نام دیا ہے کی رہ نمائی وہ خود کرتا ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ○ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○ (البلد:۸-۱۰)

''کیا ہم نے اسے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور دونوں نمایاں راستے اسے (نہیں) دکھا دیے؟''

وَ نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ○

(الشمس:۷،۸)

''قسم ہے نفس کی اور اسے درست بنانے کی، پھر سمجھ دی اس کو بدکاری کی اور تقویٰ کی۔''

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ○ (الدہر:۳)

''ہم نے اسے راہ دکھائی، اب خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا۔''

نفس لوامہ کے اطراف میں دو نفوس اور ہیں:

(۱) نفس مطمئنہ (مطمئن نفس یعنی جس نے دنیا میں نیک اعمال کیے) اور

(۲) نفس امارہ (یعنی برائی پر ابھارنے والا نفس)۔

لیکن اللہ نے گواہ نفس لوامہ ہی کو بنایا ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

نفس مطمئنہ کا ذکر قرآن میں اس طرح ہے:

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ (الفجر: ۲۷،۲۸)

”اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل، اس طرح کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے خوش۔“

نفس امارہ وہ ہے، جس کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۚ (یوسف: ۵۳)

”میں اپنے نفس کی پاکیزگی بیان نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی پر ابھارنے والا ہی ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی اپنا رحم کرے۔“

نفس لوّامہ کی شہادت

اللہ نے نفس لوامہ پر روز اول ہی میں شہادت لے لی تھی۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ۙ

(الاعراف: ۱۷۲)

”اور اے نبیؐ! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ خود تمھارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا، اور انھیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا ضرور آپ ہمارے رب ہیں اور ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔“

نفوس ناطقہ اللہ کی صفت تکوینی میں داخل ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس گواہی کو اپنے

قانون تکوینی وتشریعی کا نقطۂ اتصال بنادیا ہے، اور اس گواہی پر مسلسل شہادتیں قائم کر کے روزِ اول کے اس سلسلے کو روزِ ابد سے ملا دیا ہے۔ اللہ کی ربوبیت کی پہچان منصب رسالت سے ہوتی ہے، اس لیے اس شہادت کا امتداد اس کے رسولوں تک درجہ بہ درجہ ہوتا ہے۔

تمام انبیاء قانون شہادت کے پابند ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (آل عمران: ۸۱، ۸۲)

"اور (یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج میں نے تمھیں کتاب اور حکمت اور دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا 'کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟' انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔ اس کے بعد جو عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (الاحزاب: ۷)

"اور (اے نبیؐ!) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰ ابن مریمؑ سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔"

ان دونوں آیتوں میں ان ہدایات اور احکام الٰہی پر جو انبیائے کرام علیہم السلام کو اللہ کی طرف سے عطا کی گئیں، عہد و پیمان لیا گیا ہے، اور ہر ایک کو انفرادی اور اجتماعی طور سے گواہ بنایا گیا ہے۔

رسول اللہؐ کی شہادت تمام ملتوں کے لیے ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی اپنی امت اور تمام انبیاء کرام اور ان کی امتوں کے لیے ہے۔ بہ حیثیت نبی کے مذکورہ گواہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ کو گزری ہوئی تمام امتوں اور نبیوں پر بھی گواہ بنایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًاؕ (النساء:۴۱)

''پھر سوچو اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔''

جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام امتوں پر گواہ ہونے کا ذکر بخاری شریف میں بھی ہے، (۱۱۶) اور مومنوں کو شھداء اللّٰہ علی الارض کا خطاب دیا گیا ہے۔ (۱۱۷) یہ اس کا فضل ہے کہ اس شرف سے اس نے امت مسلمہ کو بھی محروم نہیں رکھا ہے بلکہ حکماً انھیں اس ذمہ داری میں شریک کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًاؕ (البقرہ:۱۴۳)

''اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'امت وسط' بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری زندگی لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے اور یہ فریضہ آپؐ تمام عمر انجام دیتے رہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ:۶۷)

''اے رسولؐ! جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجیے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت کا فریضہ انجام نہیں دیا۔''

دنیا سے رخصت ہوتے وقت یہ ذمے داری آپؐ نے امت مسلمہ کے سپرد کر دی۔ آپ نے حجۃ الوداع کے موقعے پر حاضرین کو خطاب کر کے پوچھا ''لوگو! بتاؤ، کیا میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا؟'' لوگوں نے جواب دیا: اللّٰھم نعم ، یعنی ''یقیناً، یقیناً۔'' اس پر آپؐ نے اللہ کو گواہ بنایا: اللّٰھم اشھد! ، ''اے اللہ! تو گواہ رہ۔'' (۱۱۸) یہ الفاظ آپؐ نے تین مرتبہ ادا فرمائے۔ (۱۱۹) آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص موجود ہے وہ غیر موجود تک (میری باتیں) پہنچا دے کیوں کہ (اس بات کا بہ ہر حال امکان ہے کہ) بعض وہ افراد جن تک (یہ باتیں) پہنچائی جائیں گی وہ بعض (موجود) سننے والوں سے کہیں زیادہ ان باتوں کے در و بست کو سمجھ سکیں گے۔'' (۱۲۰)

شہادت حق ازل سے ابد تک

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (الجمعہ:۲،۳)

''وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انھیں میں سے اٹھایا، جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے وہ کھلی گم راہی میں مبتلا تھے۔ اور (اس رسول کی بعثت) ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے ملے نہیں ہیں۔ اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔''

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا (سبا:۲۸)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

ہم نے دیکھا کہ شہادت کا سلسلہ عالم ارواح سے شروع ہوا ہے اور انبیاء در انبیاء آخری رسول حضرت محمد ﷺ تک پہنچا ہے۔ پھر آپ کی امت کے توسط سے یہ سلسلہ ان شاء اللہ تا قیامت چلا جائے گا اور وہاں اس کے بارے میں سوال ہوگا:

فَلَنَسۡئَلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَنَسۡئَلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ

(الاعراف:۶)

''پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے (کہ انھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہا تک انجام دیا اور اس کا کیا جواب ملا ہے)۔''

اس طرح یہ سلسلۂ شہادت ازل سے ابد تک قائم ہے۔

(۵) تحکیم

پانچویں چیز جس کا اللہ نے ہمیشہ اپنے بندوں کو پابند کیا وہ یہ ہے کہ تمام معاملات اور قضایا کے فیصلے اللہ کے نازل کردہ قانون ہی کے مطابق کیے جائیں۔ اس کا مقصد عدل اور قسط کا قیام ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ (النساء:۵۸)

''اللہ تعالیٰ تمھیں (تاکیدی) حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انھیں پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَ اِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِالۡقِسۡطِ ؕ (المائدہ:۴۲)

''اور اگر تم فیصلہ کرو تو ان میں عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

چوں کہ عدل وقسط کے لیے کوئی دنیوی پیمانہ معتبر نہیں ہے، اس لیے یہ معیار خالص بھی اللہ نے مقرر فرمادیا ہے۔ اور اس معیار کا نام ہے ''اللہ اور رسولؐ کی اطاعت۔'' حکم ہوتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ عدل وقسط قائم کرنا لوگوں کے درمیان ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس معاملہ میں حرف آخر (Final Authority) اللہ اور اس کے رسولؐ کو تسلیم نہ کیا جائے۔ یہی حکم تمام انبیا کی امتوں کو دیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کی روش پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ایسے لوگوں کے ایمان کی نفی کی گئی ہے اور انھیں کھلم کھلا کافر کہا گیا ہے جو توریت کے احکام کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ نہ چاہیں:

وَ كَیْفَ یُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِیْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ یَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المائدہ:۴۳،۴۴)

''اور یہ تمھیں کیسے حکم بناتے ہیں جب کہ خود ان کے پاس توراۃ موجود ہے، جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ہم نے توراۃ نازل کی، جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے

نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے)، کیوں کہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمے دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔ (پس اے گروہ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔''

اس کے بعد مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے اور توراۃ کے بعض احکام میں سہولت پیدا کرتے ہوئے احکام الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو ظالم ٹھیرایا گیا ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (المائدہ: ۴۵)

''ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔'' (۱۲۱)

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ چوں کہ ان کے اوپر کوئی نئی شریعت نازل نہیں ہوئی تھی، اس لیے انھیں توراۃ ہی کا قانون جاری کرنے کا حکم دیا گیا اور اس کی نافرمانی پر فسق کی سزا سنائی گئی۔ ارشاد ہے:

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (المائدہ: ۴۶، ۴۷)

’’پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا۔ توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی، جس میں رہ نمائی اور روشنی تھی۔ اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی، اور خدا ترس لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں، جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔‘‘

احکام توراۃ کی تاریخ بیان کرنے کے بعد آں حضور ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ عَمَّا جَآءَکَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِکُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ شِرۡعَۃً وَّ مِنۡہَاجًا ؕ (المائدہ:۴۸)

’’اور پھر اے نبیؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب بھیجی، جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو۔ اور جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل متعین کر دی ہے۔‘‘

چند قابل غور نکات

(الف) قرآن انبیائے سابقہ کی کتابوں کی نہ صرف تصدیق کرنے والا ہے بلکہ ان کا محافظ اور نگہبان بھی ہے۔ یہاں تصدیق کا حصر حفاظت اور نگہبانی سے ہے یعنی صحف سابقہ کے وہ احکام جو اصل شکل میں باقی تھے یا جو احکام لوگوں کی دست برد اور خواہشات نفس کی نذر ہو گئے تھے قرآن نے ان کی تصدیق اور تصحیح کر دی ہے۔ اسی غرض سے اللہ نے اس کتاب (قرآن) میں ایک نیا مجموعۂ احکام دیا ہے جو نہ صرف غیر متبدل ہے بلکہ غیر محرف بھی ہے۔ پھر اس کتاب اور اس کے احکام کو مستقبل کے دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر عمل درآمد اور استمرار کو لازم

قرار دے دیا۔ اپنے نبیؐ کو وہ حکم دے رہا ہے:

وَ اَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ط

(المائدہ:۴۹)

''پس اے نبیؐ! تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنہ میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔''

اس کے بعد رہتی دنیا تک عام انسانوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے:

اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ ط وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ O (المائدہ:۵۰)

''(اگر یہ خدا کے قانون سے منہ موڑتے ہیں) تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالاں کہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔''

دنیائے اسلام کی موجودہ حالت

افسوس ہے کہ آج روئے زمین پر اٹھاون مملکتیں ایسی ہیں، جہاں کے حکمراں مسلمان ہیں۔ ان میں سے جزوی طور سے چند ایک کو مستثنیٰ کرکے باقی سب جاہلیت ہی کے قانون پر عمل پیرا ہیں۔ اس جحود و انکار کی وجہ سے ان سبھوں پر اللہ کا غضب اور اس کا وبال مستولی ہے۔ اس سے بڑھ کر حرماں نصیبی اور کیا ہوگی کہ ایک تہائی روئے زمین پر حاکمیت اور دنیا میں دوسری سب سے بڑی عددی طاقت کی مالک ہونے کے باوجود امت مسلمہ ذہنی افلاس اور اخلاقی، معاشی اور معاشرتی تغلب و تسلب کا شکار ہے۔ اس ضعف و شکست خوردگی نے جاہلیت سیاسیہ کا استیصال کرنے کے بجائے خود اسلام کو استیلائے جاہلیت کا شکار بنا رکھا ہے۔ یہ ان حکمرانوں کی ذمے داری تھی کہ کم از کم اپنے ممالک محروسہ میں اللہ کا قانون رائج کرتے۔ لیکن یہ کرنے کے بہ جائے نفاذ

قانون اسلامی کا مطالبہ کرنے والوں پر قید و بند اور عقوبت کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ غیر مسلموں اور اہل کتاب کی اکثریت کے ممالک میں نہ صرف جاہلیت کا قانون نافذ ہے بلکہ وہاں کے حکمراں اسلامی قانون کی عدل گستری سے کان اور آنکھ بند کیے ہوئے ہیں۔ یہ قانون اغیار کے معاندانہ رویہ کے علی الرغم ان شاء اللہ نافذ تو ہو کر رہے گا لیکن اس قانون کے نفاذ میں حارج ہونے والے کلمہ گو مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے دہرے عذاب میں مبتلا کیے جانے کا اندیشہ ہے۔(۱۲۲)

(۶) خلافت

خلافت دراصل وہ منصب اعلیٰ ہے، جس کے لیے اللہ نے انسانوں کو پیدا فرمایا ہے:

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالاَ تَعْلَمُوْنَ ٥ (البقرہ:۳۰)

”اس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں، جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے اور خوں ریزیاں کرے گا۔ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے۔“

انسان خلیفہ کیوں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا، اس لیے اس نے اس کے اوپر بڑی نوازشیں بھی فرمائیں۔

(۱) اللہ نے انسانوں کو اشیاء کا علم دیا:

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (البقرہ:۳۱)

”اس کے بعد (اللہ نے) آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔“

(۲) اس کو تحریر کی صلاحیت بخشی:

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق:۴)

''جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔''

(۳) اس کو شرح و بیان کی قوت سے نوازا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (الرحمٰن:۳،۴)

''اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کی صلاحیت بخشی۔''

(۴) کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور اس کی گتھیاں سلجھانے کی اس کو صلاحیت بخشی:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق:۵)

''انسان کو وہ علم دیا جو وہ جانتا نہ تھا۔''

(۵) اس کو اللہ نے اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی:

وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلاً (بنی اسرائیل:۷۰)

''یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت بخشی۔''

(۶) کائنات کو ان کے لیے مسخر کر دیا تا کہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (الحج:۶۵)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی نے زمین کی تمام چیزیں تمھارے لیے مسخر کر دی ہیں اور اس کے فرمان سے پانی میں چلتی ہوئی کشتیاں بھی۔''

وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ (ابراہیم:۳۳)

''اسی نے تمھارے لیے سورج چاند کو مسخر کر دیا ہے کہ برابر ہی چل رہے ہیں اور رات دن کو بھی تمھارے کام میں لگا رکھا ہے۔''

(۷) ان سب سے بڑھ کر اسے وحی الٰہی کی رہ نمائی بخشی، جس کے بغیر وہ ناواقف راہ تھا:

وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰىؕ (الضحٰی:۷)

''ہم نے تمھیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی۔''

یہ علم ہدایت جسے قرآن میں ''وحی'' کا نام دیا گیا ہے ایسا گراں بہا علم ہے کہ اس کا وزن انسان کے علاوہ کوئی اور اٹھا نہیں سکتا تھا:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِؕ (الحشر:۲۱)

''اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ خوف الٰہی سے پست ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے۔''

ان تمام صفات عالیہ سے متصف کرنے کے بعد اللہ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ انسان کو خلافت ارضی عطا کی جائے حالاں کہ وہ اس کی کوتاہیوں سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ وہ خود فرماتا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًاۙ (الاحزاب:۷۲)

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''

خلافت کی حیثیت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے یہ کہا تھا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں:

اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةًؕ (البقرہ:۳۰)

لیکن اس نے انسانوں کو بھی خطاب کر کے فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ ؕ (الانعام:۱۶۵)

''وہی ہے، جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تا کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔''

یہ انسان کی عمومی خلافت ہے، لیکن انبیاء اور اپنے مخصوص بندوں کو وہ مقصد خلافت کا پابند بناتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (ص:۲۶)

''اے داؤد! ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنا دیا، پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔''

معلوم ہوا کہ خلافت کی ذمے داری اگر تمام انسانوں کے لیے عمومی ہے تو داعیان حق اس کے خصوصی ذمے دار ہیں۔

قرآن کی یہ آیات اس باب میں ناطق ہیں کہ اللہ کے حضور کوئی شخص یہ عذر پیش کر کے کام یاب نہیں ہوسکتا کہ اسے قوت یا شوکت حاصل یا اسے کوئی جمعیت میسر نہیں تھی کہ فریضۂ خلافت انجام دے سکتا۔ اقامت دین کے اجزاء میں سے ہم نے عقائد، عبادات، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، شہادت حق، تحکیم اور خلافت کا ذکر کیا ہے۔ ان امور شش گانہ میں صرف تحکیم اور خلافت دو امور ایسے ہیں جن کے لیے غلبہ اور شوکت کی واقعی ضرورت ہے۔ لیکن جہاں مسلمان غالب و حکمراں نہ ہوں وہاں ابتدائی چہار باتوں پر تو عمل ہر وقت اور ہر حال میں واجب ہے۔ رہے بقیہ دو امور تو حالت مغلوبیت میں بھی یہ شہادت لسانی (ذرائع ابلاغ) کی حد تک تو واجب ہی ہے۔ اگر یہ کام بالفعل نہ ہوسکے تو اللہ تمام معاملات کا نگراں ہے اور ہماری معذوریوں سے واقف ہے۔

خلافت اور اقامت دین ایک ہی ہیں

خلافت اور اقامت دین دراصل ایک ہی ذمے داری کے دو نام ہیں۔ اقامت دین

کی تفصیلات اور خلافت کی گفتگو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ نے مختلف پیرایوں میں انسان کی مطلوبہ ذمے داری کو بیان فرمایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خلافت کے عنوان سے اس نے تمام انسانوں کو مخاطب کیا ہے اور ایک پیغمبر کو مثال میں پیش کیا ہے، جب کہ اقامت دین کا مکلّف انبیاء کو ٹھیراتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کے توسط سے امت مسلمہ اس کی ذمہ دار قرار پائی ہے۔ یہ قرآن کریم کا انداز بیان ہے کہ ایک ہی چیز کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے وہ مختلف اسالیب اور متنوع طریقے اختیار کرتا ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کی مثال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خلافت یا اقامت دین ہی ''حق'' کا فیصلہ ہے۔ گویا اللہ کا دین ہی حق ہے، جس کا نفاذ خلافت کی ذمے داری ہے۔ دراصل اسلامی حکومت کا داخلی عمل ''اقامت دین'' اور خارجی مظہر ''خلافت الٰہیہ'' ہے، اس لیے ''تجدید خلافت'' تمام دنیا کے مسلمانوں کی اجتماعی ذمے داری ہے۔

دین کے قیام کے لیے قتال کا حکم

اگر دین قائم نہ ہو تو پوری دنیا میں فتنہ پھیل جاتا ہے۔ روئے ارضی طوائف الملوکی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں فتنہ کو ختم کرنے اور دین قائم کرنے کے لیے قتال فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے:

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال:۳۹)

''ان (کافروں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۠ (التوبہ:۲۹)

''جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے

اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔" (۱۲۳)

اللہ تعالیٰ دین کی تشریح فرمانے کے بعد ہی حجۃ الوداع کے موقعے پر یہ آیت نازل فرمائی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ:۳)

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، اور تمھارے اوپر اپنی نعمتوں کی تکمیل کر دی، اور تمھارے لیے اسلام کو دین (طریق زندگی) کی حیثیت سے پسند کرلیا۔" (۱۲۴)

اقامت دین کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدو جہد

اوپر کی سطور میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جہاں جہاں گئے وہاں انھوں نے دین حق کی تبلیغ کی۔ اس دین کی وہی تفصیلات ہمارے سامنے ہیں جو قرآن میں موجود ہیں۔ بائبل اس سلسلے میں کوئی رہ نمائی نہیں کرتی۔ قرآن کی رو سے آپؑ نے بہ حکم خداوندی عبادات کا پورا نظام قائم کیا۔ اس کے لیے مساجد بنائیں۔ ان میں مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ صحیفۂ ابراہیمؑ میں دین کی اور بہت سی تفصیلات رہی ہوں گی، کیوں کہ آپؑ کے بعد آپؑ کے جانشینوں نے اس وعدہ کے مطابق زندگی گزاری، جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں جس طرح حکومت کی اس کی قدرے تفصیل اوپر آچکی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مکمل کتاب شریعت دی گئی۔ اس کتاب شریعت کو نافذ کرنے کے لیے اللہ نے آپؑ کو فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ اس کے کچھ احکام (خصوصاً قتل مرتد) پر آپ نے دشت سینا میں عمل بھی فرمایا۔ لیکن بنی اسرائیل کی بزدلی (۱۲۵) کی وجہ سے آپؑ دین کا قیام کیا فرماتے اپنی زندگی میں ارض موعود پہنچ بھی نہیں سکے۔ پھر بعد میں آنے والے پیغمبروں کے ذریعے فلسطین میں یہ کام حسب توفیق جاری رہا۔ ان میں حضرت داؤد علیہ السلام جیسے صاحب کتاب اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اقامت دین کی خاطر مامور فرمایا جیسا کہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں گزر چکا ہے۔ آپ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے اس لیے آپؑ کو کوئی نئی شریعت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے علم کے مطابق آپؑ بوجوہ دین کی اقامت کا فریضہ انجام

نہیں دے سکے۔ ہاں، آپؑ نے اپنی قوم کو آں حضور ﷺ کی آمد کی بشارت دے دی، جو من جملہ آپؑ کے فرائض نبوت میں شامل تھا۔ اس کا ذکر اللہ نے سورۂ صف کی چھٹی آیت میں کیا ہے۔

توریت کی زبان میں اللہ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو آتشیں شریعت دی تھی، جسے مکمل طور سے نافذ کیا جانا مقصود تھا، اس لیے اللہ نے اس کے لیے ساز گار حالات پیدا کیے۔ ان میں بہ طور تدبیر خاص کر واقعۂ ہجرت بھی ہے۔ لیکن چوں کہ دعوت کی ابتدا مکہ میں ہوئی اس لیے یہاں مکی اور مدنی دونوں ادوار کی دعوت کا جائزہ لیا جائے گا۔

اقامت دین کے لیے مکہ میں حضور اکرمؐ کی جدوجہد

۱- رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت روئے زمین پر دو قوتوں کی اجارہ داری تھی۔ عراق، مشرق اور شمال میں جیحون تک کسریٰ ایران اور شام، اقصائے مغرب تا بحد ڈینوب قیصر روم کی عمل داری میں شامل تھے۔ خود جزیرۃ العرب کا مشرقی وجنوبی حصہ بہ شمول یمن، ایران کے ماتحت اور شمال مغربی حصہ بہ شمول مصر وحبشہ رومیوں کے زیر تسلط تھے۔ صرف وسطی صحرا اور مغربی ساحل کا علاقہ عرب کا خود مختار علاقہ تھا جہاں مختلف قبائل کی بالادستی تھی۔ خانۂ کعبہ کی وجہ سے مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس لیے اس علاقے میں قریش کی سیادت کو پورا عرب تسلیم کرتا تھا۔ اس وقت کے حالات میں اگر مکے میں کوئی باضابطہ حکومت قائم ہو جاتی تو پورے عرب کا اس کی قیادت میں متحد ہونا لازمی تھا۔

۲- مکہ اس روئے زمین کا ناف ہے۔ اس کی مرکزیت کے بارے میں خود کچھ لکھنے کے بہ جائے ایک مشہور محقق کے دلائل انھی کی زبان میں نقل کر دینا مناسب ہوگا۔

> ''کرہ ارض پر آباد دنیا کو دیکھو کہ جنوب میں زیادہ سے زیادہ ۴۰ درجہ عرض البلد، اور شمال میں زیادہ سے زیادہ ۸۰/ درجہ تک آبادی ہے۔ دونوں کا مجموعہ ۱۲۰ درجہ اور نصف ۶۰ ہوا۔ جب ۶۰ کو ۸۰ درجہ شمالی سے تفریق کریں تب ۲۰ رہ جاتے ہیں۔ اور ۶۰ میں سے ۴۰ درجہ جنوبی کو تفریق کر دیں تب بھی ۲۰ درجہ شمالی رہ جاتے ہیں۔ اور مکہ معظّمہ ۵ ء۲۱ درجہ پر آباد ہے۔ اس لیے کرۂ ارض میں یہی وسط ہونے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مکہ کا نام لغات کی کتابوں میں ''نافِ زمین'' ہے۔ انسان کے جسم میں ناف ٹھیک وسط میں نہیں ہوتی، بلکہ تقریباً وسط میں ہوتی ہے اور یہی وجہ

ہے کہ عرض بلد میں مکہ وسط حقیقی کے قریب تر واقع ہوا ہے۔ ڈیڑھ درجہ کا جو تفاوت ہے وہ اس لیے ہے کہ مکہ ناف زمین ثابت ہو۔ اب اس طرح سمجھو کہ ملک عرب ۱۵ سے ۳۵ درجہ ہائے عرض البلد شمالی پر واقع ہوا ہے۔ اور انھی خطوط کے اندر دنیا کی تمام مشہور نسلیں اس طرح مقیم ہیں کہ مشرق میں آریہ و منگول اور مغرب میں حبشی و ہامائٹ (نسل حام جو حضرت نوحؑ کے ایک بیٹے تھے) اور ریڈ انڈینز (امریکہ کے اصلی باشندے)۔ اور جب کل قوموں میں تبلیغ کا پہنچانا مدنظر ہو تو عرب ہی اس کا مرکز قرار دیا جاسکتا ہے۔ غالباً اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

(البقرہ:۱۴۳)

''اور ایسے ہی ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا ہے تاکہ تم قوموں کے سامنے خدا کی شہادت ادا کرو۔''(۱۲۶)

۳- خود مکہ میں بنو ہاشم سب سے بڑے سرداروں میں تھے۔ اس لیے جب تک حضرت ابوطالب زندہ رہے، رسول اللہ ﷺ کو اپنے قبیلہ کا تحفظ حاصل رہا۔

اقامت دین کے لیے مدینہ میں حضور اکرمؐ کی جدوجہد

۱- عربوں کے دو قبائل اوس اور خزرج کے علاوہ اس وقت مدینہ میں تیسری قوت یہودیوں کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی ان سب کو متحد کردیا، جس کے نتیجے میں یہ اہل مکہ کے بالمقابل ایک عسکری قوت بن گئے۔

۲- اہل حجاز کے ایمان لاتے ہی پورا جزیرۃ العرب اسلام کے جھنڈے تلے اکٹھا ہوگیا۔ پھر یہ سیل رواں جب باہر نکلا تو ایران کی کج کلاہیت اور روم کی فغفوریت کو بہالے گیا۔ اسلام کی اس درجہ نشرواشاعت کے لیے آپؐ نے جو تیاریاں کیں وہ اس طرح ہیں۔

● معاہدات۔ سب سے پہلے آپؐ نے اہل یثرب نیز قبائل یہود کو ایک معاہدہ کے تحت یکجا کیا۔ پھر قبیلۂ بنی حمزہ بن بکر بن عبد مناف کو اس میں شریک کیا۔ اس کے بعد بالترتیب

اہل کوہ بواط اور بنو مدلج اس میں شریک کیے گئے۔اس طرح اہل مکہ کے خلاف آپؐ نے تمام قبائل مدینہ کو اکٹھا کرلیا۔(۱۲۷)

● مواخات۔مہاجرین اور انصار میں مواخات رسول اللہ ﷺ کا وہ قابل قدر کارنامہ ہے،جس نے تاریخ عالم میں ایک روشن باب رقم کیا ہے۔

● غزوات اور سرایا۔ان کی تعداد صاحب رحمۃ للعالمین نے ۸۲ شمار کی ہے۔(۱۲۸)
ان میں جنگ بدر(اولیٰ)،جنگ احد،جنگ احزاب(خندق)،صلح حدیبیہ،فتح مکہ،جنگ موتہ اور غزوۂ تبوک انتہادرجہ اہمیت کے حامل ہیں۔

● مکتوبات نبویؐ۔آپؐ نے مختلف ممالک اور اہالیان مذاہب کو دعوتی خطوط ارسال فرمائے،جن میں خاص یہ ہیں: ''شاہ حبش،شاہ بحرین،ملک عمان،حاکم دمشق،حاکم یمامہ،شاہ اسکندریہ ومصر،شاہ قسطنطنیہ،شاہ ایران۔(۱۲۹)

● وفود کا استقبال۔رسول خداؐ اور حاکم مدینہ کی حیثیت سے آپؐ نے ۲۶/وفود کا استقبال فرمایا۔

صاحبان شریعت انبیاء کی ہجرت اقامت دین کی خاطر ہوا کرتی تھی۔مگر انبیائے سابقین اپنے مشن میں اتنا ہی کام یاب ہوئے جتنا اللہ نے ان کے نصیب میں مقدر کر رکھا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی ہجرت ایسی مبارک تھی کہ صرف دس سالوں میں اللہ کا پورا دین قائم ہوگیا اور آپؐ کی ذات سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا،جو رہتی دنیا تک کے لیے قابل رشک اور قابل تقلید نمونہ ہے۔

باب چہارم

انبیاء علیہم السلام کی دعوتی سرگزشت

دین کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ فقہی اصطلاح میں دین اور دوسرا شریعت کہلاتا ہے۔ دین میں عقائد، عبادات اور مکارم اخلاق کی وہ تمام باتیں آجاتی ہیں، جن کا تفصیلی ذکر اس کتاب کے جزو اول میں ہوا ہے۔ شریعت اس قانون کا نام ہے، جس سے معاشرہ میں پاکیزگی اور نظم و ضبط برقرار رہتا ہے، انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور ملکی و بین الاقوامی تعلقات میں اصلاح بھی اس سے ہوتی ہے۔ جہاں شریعت کے قائم ہونے کا امکان نہ ہو، وہاں بھی کم از کم دین کی دعوت دینا فرض ہے۔ صاحبان شریعت انبیاء بھی ابتدا میں صرف عقائد اور عبادات ہی کی دعوت دیا کرتے تھے۔ دعوت دین میں یہ ترجیح صرف تدریج کے لیے ہے۔ ورنہ دین مکمل ہو جانے کے بعد حسب موقع پورے اسلام کی دعوت دینا تمام ایمان والوں پر فرض ہے۔

عقائد کی اصلاح

اسلام کی بنیاد شرک کے ابطال اور توحید کے قیام پر ہے، اسی لیے انبیاء کی دعوت کا آغاز عقائد کی اصلاح سے ہوا کرتا تھا۔ چناں چہ ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل:۳۶)

''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعے خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰـهَ
اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ۝ (الانبیاء:۲۵)

''ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔''

اس حکم عام کے بعد خصوصیت سے مختلف پیغمبروں کی دعوت کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

۱۔حضرت نوح علیہ السلام

تاریخی ترتیب میں حضرت آدم علیہ السلام کے بعد قرآن میں جس پیغمبر کا ذکر آیا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ آپؑ اپنی دعوت ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَالَکُمۡ
مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ۝

(الاعراف:۵۹)

''ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔''

پیغمبر کے ذریعے توحید کی دعوت کے دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں شرک سے اجتناب، دعوت توحید اور رسول کی رسالت پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔

سورۂ نوح میں ارشاد فرمایا:

اِنَّـاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ
یَّاۡتِیَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝ۙ اَنِ
اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ۝ۙ (نوح:۱-۳)

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کردے قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آئے۔ اس نے کہا اے

میری قوم کے لوگو! میں تمھارے لیے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں۔تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری طاعت کرو۔"

۲۔حضرت ہود علیہ السلام

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (الاعراف:٦٥)

"اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔اس نے کہا اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کروگے۔"

یہاں بھی اولین دعوت،شرک سے اجتناب اور توحید کے اقرار کی ہے۔

۳۔حضرت صالح علیہ السلام

وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمْ اٰیَۃً فَذَرُوْھَا تَاْکُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ وَلَا تَمَسُّوْھَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَکُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (الاعراف:۷۳)

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔اس نے کہا اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔تمھارے پاس تمھارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے،لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔اس کو کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آلے گا۔"

۴۔حضرت ابراہیم علیہ السلام

وَاِبْرٰھِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْکًا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ

لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ○ (العنکبوت:۱۶،۱۷)

''اور ابراہیم کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا 'اللہ کی بندگی کرو، اور اس سے ڈرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمھیں رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔''

یہ آیتیں بتلاتی ہیں کہ اپنے وطن عراق میں ہجرت سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولین دعوت شرک سے اجتناب، اللہ کی عبادت و اطاعت اور اسی سے استمداد تھی۔

۵- حضرت لوط علیہ السلام

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ ز مَا سَبَقَکُمْ بِھَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۵لا وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ ط فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ○ع (العنکبوت:۲۸-۳۰)

''اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: تم تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ تمھارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو۔ پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انھوں نے کہا: لے آ اللہ کا عذاب، اگر تو سچا ہے۔ لوط نے کہا اے میرے رب! ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔''

اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے سدوم اور عمورہ کی بستیوں کی طرف متعین کیا تھا تا کہ وہاں کے لوگوں کی وہ اصلاح کر سکیں۔ قوم لوطؑ کی جن بداعمالیوں کا بیان سورۂ عنکبوت میں ہے اس کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کے

بعد ہے۔ اگرچہ ان آیات میں اللہ کی بندگی اور رسول کی اطاعت کا واضح ذکر نہیں ہے لیکن ان آیتوں کو دعوت ابراہیمی ہی کے سیاق میں پڑھنا چاہیے۔ ایک ایسے فحش کام کا ارتکاب جس سے انسان پہلے واقف بھی نہیں تھا، اس وقت تک نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ انسان خدا کو بالکل بھول نہ جائے، اس لیے پیغمبر کے لیے لازم تھا کہ دعوت توحید دینے کے بعد ہی وہ ان کے قبیح اخلاقی مرض سے تعرض کرے، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کیا۔

۶۔ حضرت شعیب علیہ السلام

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ وَلَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِہٖ وَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا ۚ وَاذْکُرُوْٓا اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ ۠ وَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝

(الاعراف:۸۵،۸۶)

''اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہ نمائی آگئی ہے، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو۔ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہوچکی ہے۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستہ سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے، پھر اللہ نے تمھیں بہت کر دیا، اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔''

ان آیات میں قوم کی بڑی برائیوں کی اصلاح کی دعوت سے قبل صرف ایک خدائے واحد کی بندگی کی طرف بلایا گیا ہے۔

۷- حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو ذمے داریاں دی گئی تھیں۔ ایک فرعون کو شرک سے روکنا، دوسرے بنی اسرائیل کو لے کر فلسطین جانا تا کہ وہاں دین قائم ہو سکے۔ یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی اولین ذمے داری فرعون کے دعوائے ربوبیت کا رد کر کے اسے توحید کی طرف بلانا تھا۔(۱۳۰)

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ○ اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ○ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ○ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ○ فَكَذَّبَ وَ عَصٰى ○ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ○ فَحَشَرَ فَنَادٰى ○ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ○ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○ (النازعات: ۱۵-۲۶)

"کیا تمھیں موسیٰؑ کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کہ 'کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف رہ نمائی کروں تو (اس کا) خوف تیرے اندر پیدا ہو۔ پھر موسیٰؑ نے (فرعون کے پاس جا کر) اس کو بڑی نشانی دکھائی مگر اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا۔ پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا۔ اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکار کر کہا 'میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں'۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔"

۸- نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو روئے زمین کے تمام انسانوں کے لیے نبی اور رسول بنا کر بھیجا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا (سبا:۲۸)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

نیز فرمایا:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (الانبیاء:۱۰۷)

''(اے نبیؐ!) ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ کی مکی زندگی کے بھی ابتدائی تیرہ سال شرک کی تردید اور توحید کی دعوت میں گزرے۔ قرآن کریم کا تقریباً ایک تہائی حصہ اصلاح عقائد کی آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں میں چھیاسی (۸۶) سورتیں مکی ہیں، جو مقدار کے لحاظ سے تقریباً ایک تہائی قرآن کے برابر ہیں۔ سورۂ اخلاص کو جو توحید کی مختصر ترین تشریح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہائی قرآن قرار دیا ہے۔ (۱۳۱) یہاں سورۂ کہف کی صرف ایک آیت پیش کی جاتی ہے، جو اسلامی عقیدہ کے تینوں اجزاء یعنی توحید، رسالت اور آخرت کو جامع ہے:

قُلۡ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُکُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا
یُشۡرِکۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ۠ (الکہف:۱۱۰)

''اے نبیؐ! کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو، اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔''

قومی اور اجتماعی امراض کی نشان دہی، شرک کی نجاست اور حسن اخلاق کا بیان، توحید کی دعوت میں شامل ہیں۔ یہ ایک بہت اہم نکتہ ہے جسے ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے جہاں شرک کے خلاف تبلیغ کی ہے وہیں اپنی قوم کے اجتماعی امراض کے ازالے کی بھی جدوجہد کی ہے۔ قرآن کریم نے اس سلسلے میں تین نبیوں کا خصوصیت سے نام لیا ہے۔ ایک حضرت لوط علیہ السلام، دوسرے حضرت شعیب علیہ السلام اور تیسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ ابھی ہم نے

سورۂ عنکبوت کی آیات ۲۸ تا ۳۰ میں دیکھا کہ حضرت لوطؑ نے کس طرح اپنی قوم کی ہم جنسی کی عادت بد اور ان کی رہزنی کے کاروبار پر تنقید فرمائی۔ اسی طرح سورۂ اعراف کی آیات ۸۵و۸۶ میں حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کی ناپ تول میں کمی کی عادت اور فساد فی الارض کی روش پر تنقید فرمائی ہے۔ سورۂ نازعات کی آیات ۱۵تا۲۶ ہمیں بتلاتی ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو اس کی خدائی کے خلاف خبردار کیا تھا۔ سورۂ شعراء کی آیت ۱۷ اور ۲۲ میں آپؑ اسے بنی اسرائیل کو جبری بے گار اور غلامی کی زندگی سے آزاد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں حسن اخلاق کی تعلیم حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی ہے۔ مفسرین کی اکثریت گو انھیں نبی نہیں مانتی لیکن حکیم تسلیم کرتی ہے کہ کیوں کہ قرآن نے سورۂ لقمان کی آیت ۱۳ میں انھیں حکمت ہی دینے کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی حکمت کی وجہ سے انھوں نے اپنے بیٹے کو وہ نصیحتیں کی ہیں جو اسی سورہ میں آگے آیات ۱۴ تا ۱۹ میں مذکور ہیں: (۱) شرک سے پرہیز کرنا (۲) اللہ اور والدین کا شکر گزار ہونا (۳) معروفات میں والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا (۴) اللہ کی خوش نودی طلب کرنا اور اسے لطیف و خبیر سمجھنا (۵) نماز قائم کرنا (۶) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا (۷) مصیبتوں پر صبر کرنا (۸) شیخی میں چہرہ نہ بگاڑنا اور نہ زمین پر اکڑ کر چلنا (۹) رفتار میں میانہ روی اختیار کرنا (۱۰) آواز کا پست رکھنا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ انعام کی آیات ۱۵۱ تا ۱۵۳ میں نو چیزوں کا حکم دیا ہے: (۱) شرک سے بچو (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو (۳) اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو (۴) بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ (۵) انسانی جانوں کا احترام کرو (۶) مال یتیم کے قریب بھی نہ پھٹکو (۷) ناپ تول میں کمی نہ کرو (۸) بات انصاف کی کرو (۹) اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۳۸ میں مزید کچھ دفعات کا اضافہ کیا گیا ہے: (۱) صرف اللہ کی عبادت کرو (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور ان کی کسی بات پر اف تک نہ کہو (۳) رشتہ دار، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو (۴) فضول خرچی نہ کرو (۵) کسی کو نہ دینا ہو تو نرمی سے معذرت کرو (۶) اسراف اور بخل دونوں سے بچو (۷) رزق کی تنگی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرو (۸) زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو (۹) ناحق قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو (۱۰) یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو

(۱۱) عہد کی پابندی کرو (۱۲) ناپ اور تول برابر دو (۱۳) خواہ مخواہ بلاضرورت کسی چیز کی کرید نہ کرو (۱۴) زمین پر اکڑ کر مت چلو۔

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ ان میں پہلا نمبر کلمۂ شہادت کا ہے جس کا پہلا جز کلمۂ رسالت ہے۔ پھر کلمۂ توحید کے بھی دو اجزا ہیں، پہلا شرک سے انکار اور دوسرا توحید کا اقرار:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ (۱۳۲)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔''

شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات تمام انبیاء کا اولین مشن رہا ہے، اس لیے ان کی دعوت کی ابتدا اسی کام سے ہوتی ہے۔ لیکن دعوت کے کسی بھی مرحلے میں اس بنیادی کام سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ قوموں کے اجتماعی گناہ کے امراض شرک میں اور حسن اخلاق کے تمام کام توحید کی دعوت میں شامل ہیں۔ ہم اوپر کی سطور میں اللہ کے مقرر کردہ آٹھ نبیوں کی دعوت کی ابتدا دیکھ چکے ہیں۔ یہ تصور اسلام کا اصل الاصول ہے اور کیوں نہ ہو کیوں کہ یہ عقیدہ ہی مدار نجات ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا٥

(النساء:۴۸)

''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا، اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کرے اس نے بہت بڑا گناہ اور بہتان باندھا۔''

معلوم ہوا کہ بغیر توحید کے دین کا قیام ممکن نہیں ہے۔

تدریج

احکام شریعت میں تدریج ہے اور اس تدریج کی دو شکلیں ہیں، پہلی کسی مخصوص شے کے

اصل حکم کے نزول میں تدریج، جیسے شراب اور جوئے کی حرمت۔ دوسرے جملہ احکام شریعت کے نزول ونفاذ میں تدریج۔

کسی ایک مسئلے کے حکم میں تدریج

(۱) ۲ھ میں جنگ بدر سے پہلے رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ اس وقت یہ رعایت رکھی گئی کہ جو روزہ برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں پھر بھی روزہ نہ رکھیں تو وہ ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں، لیکن ایک سال بعد ان لوگوں سے یہ رعایت سلب کر لی گئی۔ پہلا حکم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۴ اور دوسرا حکم آیت ۱۸۵ میں ہے۔

(۲) شراب کی حرمت تین درجے میں نازل ہوئی۔ (۱۳۳) پہلے لوگوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ شراب اور جوا اللہ کی ناراضگی کے کام ہیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی: ''لوگ پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے، آپ کہہ دیجیے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے۔'' پھر سورۂ نساء کی آیت ۴۳ میں نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کردی گئی: ''جب تم نشے کی حالت میں ہوتو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔'' پھر سورۂ مائدہ کی آیت ۹۰ میں اسے مطلق حرام قرار دے گیا: ''اے ایمان والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے اور شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔''

(۳) سود کی حرمت میں متعدد جگہوں پر قرآن میں کئی آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

البقرہ: ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۸۔ آل عمران: ۱۳۰۔ النساء: ۱۶۱۔ الروم: ۳۹

لیکن اس کی آخری حرمت کا اعلان آپؐ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا اور کہا:

وَ رِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَ اَوَّلَ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسَ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ. فَاِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ. (۱۳۴)

''جاہلیت کے زمانے کا سود ملیامیٹ کردیا گیا۔ پہلا سود اپنے خاندان کا جو میں مٹاتا ہوں وہ عباس ابن عبدالمطلب کا سود ہے۔ وہ سارے کا سارا چھوڑ دیا گیا۔''

واضح رہے کہ سود کی حرمت پر اور بہت سی احادیث کتب حدیث میں موجود ہیں۔(۱۳۵)

احکام دین میں تدریج

قرآن کریم کا تقریباً ایک تہائی حصہ احکام پر مشتمل ہے۔ یہ احکام خصوصیت سے مدنی سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں نہ تو اس کا استقصاء کیا جاسکتا ہے نہ ہی یہ مقصود ہے۔ توضیح مقصد کے لیے مدنی سورتوں کے مطالب کی طرف چند اشارے کیے جارہے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی اسٹیٹ کے قیام کے لیے خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا تدریج ملحوظ رکھی ہے۔

مکی سورتوں کے مضامین

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مکی زندگی میں اللہ نے اپنے رسولؐ کو جو وحی بھیجی وہ عقائد سے متعلق تھی، لیکن اس عرصے میں مکارم اخلاق کی تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

سورۂ انعام کی آیات ۱۵۱ تا ۱۵۳ میں اللہ نے کچھ حرمتیں عائد کی ہیں: (۱) شرک سے بچو۔ (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (۳) اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ (۴) بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ (۵) انسانی جانوں کا احترام کرو۔ (۶) مال یتیم کے قریب نہ جاؤ۔ (۷) ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ (۸) بات انصاف کی کرو اور (۹) اللہ کے عہد کو پورا کرو۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ میں اللہ نے حکم دیا ہے: (۱) شرک سے پرہیز کرو۔ (۲) والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کا احترام کرو۔ (۳) رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ (۴) فضول خرچی نہ کرو۔ (۵) حاجت مندوں سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔ (۶) اسراف اور بخل دونوں سے بچو۔ (۷) تنگیِ رزق کے خطرہ سے اولاد کو قتل نہ کرو۔ (۸) زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ (۹) ناحق کسی کو قتل نہ کرو۔ (۱۰) یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ (۱۱) عہد کی پابندی کرو۔ (۱۲) ناپ تول برابر رکھو۔ (۱۳) علم کے مقابلے میں گمان سے بچو۔ (۱۴) زمین پر اکڑ کر مت چلو یعنی غرور نہ کرو۔

سورۂ لقمان کی آیات ۱۳ تا ۱۹ میں لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت ان الفاظ میں ہے: (۱) شرک سے بچو۔ (۲) والدین اور خصوصیت سے والدہ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ (۳) اللہ کو عالم الغیب جانو۔ (۴) نماز قائم کرو۔ (۵) نیکیوں کا حکم کرو۔ (۶) برائیوں سے روکو۔ (۷) صبر

اور برداشت کی قوت پیدا کرو۔ (۸) لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کرو۔ (۹) زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ (۱۰) گفتگو میں آواز پست رکھو۔

تہذیب اخلاق کے لیے جو نصیحتیں اوپر کی گئی ہیں انھیں بار بار دہرایا گیا ہے۔ مدنی سورتوں میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے بلکہ تحسین اخلاق میں مزید پیش رفت ہوئی ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں انفاق فی سبیل اللہ کو قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلین پر خرچ کرنے کے علاوہ غلامی کی آزادی کی ایک مد اور بڑھا دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ انفاق کا یہ مطلوبہ عمل زکوٰۃ کے علاوہ ہے، کیوں کہ زکوٰۃ کی ادائی کا حکم الگ سے دیا گیا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۳۶ میں اس فہرست کو مزید وسعت دی گئی ہے اور قریب کے پڑوسی، دور کے پڑوسی اور مختصر وقت کے ہنگامی پڑوسی کے علاوہ غلاموں اور لونڈیوں پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مدنی سورتوں کے مضامین

قرآن کریم کی سورتوں کی نزولی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ لیکن شان نزول سے جو ترتیب زمانی مقرر کی جاسکتی ہے اس کی رو سے اگر دیکھا جائے تو مدینہ پہنچنے کے بعد اولین احکام میں سے ایک حکم نماز جمعہ کی عظمت کا ہے، جس کے لیے خرید و فروخت ترک کر دینے کا واضح حکم دیا گیا ہے اور کاروبار دنیا کو مؤخر کیا گیا ہے۔ لیکن روزی کی تلاش کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے (الجمعہ: ۹، ۱۰)۔ ہجرت کے ابتدائی زمانے ہی میں جہاد کی اجازت دی گئی (الحج: ۳۹)۔ سورۂ تغابن میں یہ بتلایا گیا کہ اس دنیا میں جو عمل کیا جائے گا اسی کی بنیاد پر آخرت میں ہار جیت کا فیصلہ ہوگا۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی ارشاد فرمائی گئی کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہیں (التغابن: ۱۵)۔ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد سورۂ انفال نازل ہوئی۔ اس سورہ میں ان کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی جو اخلاقی حیثیت سے مسلمانوں میں باقی تھیں۔ ان کو بتلایا گیا کہ فتح تمھاری جرأت اور شہامت کی مرہون منت نہیں بلکہ تائید الٰہی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ مال غنیمت کے بارے میں فیصلہ کیا گیا کہ یہ اللہ کا مال ہے، اس لیے وہ تمھارے لیے جو حصہ مقرر کرے اسے خوش دلی سے قبول کرلو۔ اس سورہ میں مشرکین، منافقین اور یہود جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئے تھے، ان کو بھی کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں۔ قانون صلح و جنگ کی دفعات مرتب ہوئی ہیں اور دارالاسلام میں بسنے والے مسلمانوں کی حیثیت کو دارالاسلام سے باہر کے مسلمانوں سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اسی زمانے میں سورۂ صف کا نزول ہوا ہے، جس میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کی روش حضرت

موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں کی روش سے الگ ہونی چاہیے۔ سچے دل سے ایمان لانے اور جان و مال سے جہاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح ''انصار اللہ'' بننے پر ابھارا گیا ہے۔

سورۂ آل عمران کا کچھ حصہ جنگ احد کے تبصرہ پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس میں ان کم زوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کی بنا پر مسلمان شکست سے دو چار ہو گئے تھے۔ اس سورہ کے انداز تقریر اور سورۂ بقرہ کے انداز تقریر میں یکسانیت ہے۔ ان دونوں سورتوں میں اہل ایمان اور اہل کتاب کے کردار کا تقابل کیا گیا ہے۔ یہ دونوں سورتیں اس زمانے میں نازل ہوئی ہیں جب کہ مسلمان کفار مکہ سے جنگ کرنے کے علاوہ یہود مدینہ کی سازشوں کا بھی شکار تھے۔ سورۂ آل عمران کا ایک حصہ ۹ھ میں وفد نجران کی آمد کے وقت نازل ہوا تھا۔ اسی سورہ کی آیت ۶۱ میں عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی ہے۔ چوں کہ سورۂ آل عمران میں خصوصیت سے عیسائیوں کا اور سورۂ بقرہ میں یہودیوں کا ذکر ہے اس لیے مفسرین ان دونوں سورتوں کو سورۂ فاتحہ کے آخری الفاظ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ ''(ہمیں سیدھی اور سچی راہ دکھا) ان کی راہ نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ ان کی جو گم کردۂ راہ ہو گئے۔'' کا جواب تصور کرتے ہیں یعنی یہود کی قوم مغضوب ہے اور نصاریٰ قوم ضال۔ اول الذکر کی دلیل میں قرآن کی کئی آیتیں ہیں جیسے البقرہ: ۶۱، ۹۰۔ آل عمران: ۱۱۲۔ المائدہ: ۶۰۔ عیسائیوں کی ضلالت پر سورۂ حدید کی آیت ۲۷ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ ''اور رہبانیت (ترک دنیا) تو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر رکھی تھی۔ ہم نے ان پر اسے واجب نہ کیا تھا سوائے اللہ کی رضا جوئی کے، سو انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔'' اور سورۂ مائدہ کی آیت ۷۷ دلیل ہے: وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ... ''اور ان لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے بہک چکے ہیں اور بہتوں کو بہکا بھی چکے ہیں اور سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔'' (۱۳۶)

سورۂ بقرہ کا کچھ حصہ ہجرت کے ابتدائی دور کا ہے اور اکثر حصہ وہ ہے جو بعد میں نازل ہوا، یہاں تک کہ سود کی حرمت کی آیت مدینہ کے آخری دور میں نازل ہوئی اور آپؐ نے حجۃ الوداع میں اس کا اعلان کیا۔ دراصل مدینہ پہنچنے کے بعد مسلمانوں کو زندگی کے طرح طرح کے مسائل میں دینی رہ نمائی کی ضرورت پیش آتی رہی۔ اس لیے طرح طرح کے سوالات آتے گئے اور

اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے رہ نمائی فرماتا رہا۔ سب سے پہلے یہودیوں کی فرد قرارداد جرم سنانے کے بعد انھیں رہ نمائی کے منصب سے معزول کیا گیا اور اس کی علامت کے طور پر یہودیوں کے قبلہ بیت المقدس کو چھوڑ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنا کردہ خانۂ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ (واضح رہے کہ قبلۂ اول بھی اللہ ہی کا مقرر کردہ تھا اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں خانہ کعبہ کے چالیس سال بعد ہوئی تھی)۔ یہ بھی بتلایا گیا کہ نیکی کسی مخصوص طرف رخ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائی کا نام ہے۔ حدود وتعزیرات میں قصاص اور دیت کے احکام دیے گئے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی۔ رشوت کا قلع قمع ہوا۔ حج وقتال اور حرمت کے مہینوں کے احکام بیان ہوئے۔ شراب اور جوئے کی برائی بیان کی گئی۔ خواتین کے مخصوص مسائل بیان کیے گئے۔ طلاق کا اصول بیان کیا گیا (اس کا کچھ بیان سورۂ احزاب اور سورۂ طلاق میں بھی ہے)۔ سود کی حرمت کا حکم اگرچہ بعد میں نازل ہوا ہے لیکن تفصیلی احکام کے ضمن میں اللہ نے اس کو یہیں جگہ دی ہے۔ سب سے آخر میں رہن بالقبض اور لین دین کے معاملات کو قید تحریر میں لے آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۂ حشر کا زمانۂ نزول ۴ھ ہے۔ اس سورہ میں غزوۂ بنونضیر پر تبصرہ ہے۔ ۴ھ اور ۵ھ کے درمیان سورۂ نساء نازل ہوئی۔ اس میں سورۂ بقرہ کی ہدایات کی تفصیل ہے۔ مزید اس سورہ میں خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے۔ بے قید نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی حد بندی کی گئی۔ طہارت اور پاکیزگی کا اصول بیان کیے گئے اور قانون وراثت عطا کیا گیا۔

۵ھ میں سورۂ احزاب نازل ہوئی۔ اس وقت تک نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے احکام قریب قریب مکمل ہو چکے تھے۔ شراب اور جوئے کو بھی حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ اب تبنیت یا گود لینے (Adoption) کی بیخ کنی کی گئی۔ پردہ کے ابتدائی احکام دیئے گئے۔ نبی ﷺ کو نکاح کے سلسلے میں خصوصی رخصت عطا کی گئی۔ ازواج مطہرات کے گھروں میں غیر مردوں کی آمد و رفت پر پابندی لگائی گئی۔ افواہ بازی پر سخت زجر وتوبیخ کی گئی اور رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ سورۂ مجادلہ میں ظہار کے احکام بتائے گئے۔ مجلسی آداب اور حضور ﷺ سے تخلیہ میں گفتگو کرنے کی شرائط بیان کی گئیں۔

سورۂ فتح ۶ھ میں نازل ہوئی۔ اس سورہ میں صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی سورہ میں بیعۃ الرضوان کا ذکر ہے۔

سورۂ حجرات کی آیتیں مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔ اس سورہ کی ابتدا میں رسول اللہ ﷺ کے خصوصی حقوق (Prerogatives) کا تذکرہ ہے اور مسلمانوں کو ادب کی تعلیم دی گئی ہے۔ خبروں کی تحقیق پر زور دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی آپسی جنگ میں صلح کرانے کا حکم ہے۔ آپسی تعلقات میں رخنہ ڈالنے والے مفاسد، جیسے ایک دوسرے کا مذاق اڑانے، طعن کرنے، نام بگاڑنے، بدگمانی کرنے اور تجسس اور غیبت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ نور میں جو ۶ھ میں نازل ہوئی، مسلمانوں کو مزید معاشرتی احکام دیے گئے۔ پردہ رائج ہوا۔ زنا اور قذف (بدکاری کی تہمت لگانا) تعزیری جرم قرار دیے گئے۔ بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ نبی کو اذیت دینا، دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی لعنت اور رسوا کن عذاب کا موجب ہے۔ سورۂ منافقون میں منافقین کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور عبداللہ بن ابی پر تنقید کی گئی ہے۔

سورۂ مائدہ کا بھی زمانۂ نزول ۶ھ ہے۔ اس سورہ میں مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی سے متعلق مزید احکام وہدایات دیے گئے۔ شعائر اللہ کے احترام کا حکم اور کھانے پینے میں حرام وحلال کے حدود قائم کیے گئے۔ وضو، غسل اور تیمّم کے قاعدے مقرر ہوئے۔ بغاوت، فساد اور سرقہ کی سزائیں مقرر کی گئیں۔ شراب اور جوئے کو قطعی حرام قرار دیا گیا۔ قسم توڑنے کا کفارہ مقرر کیا گیا۔ قانون شہادت میں مزید دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

سورۂ تحریم میں یہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو توڑنے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے یہاں تک کہ یہ اختیار رسولؐ کو بھی نہیں۔ نبیؐ کو حلت وحرمت کی تفصیلات بیان کرنے کا تو حق ہے لیکن اللہ نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہے اسے حرام اور جسے حرام قرار دیا ہے اسے حلال کرنے کا وہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام وحلال قرار دینے کا اختیار جب رسولؐ تک کو نہیں ہے تو بدیگراں چہ رسد۔ یہ حق بندوں میں سے کس کو مل سکتا ہے؟

سورۂ ممتحنہ میں جنگی راز سے دشمنوں کو باخبر کرنے کے بارے میں بہت سخت حکم دیا گیا

ہے، کیوں کہ یہ اسلامی حکومت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ اسی سورہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان عورتوں کے لیے کافر شوہر حلال نہیں ہیں۔

سورۂ توبہ کا زمانۂ نزول ۹ ھ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں قافلۂ حج روانہ ہو چکا ہے کہ وحی آتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ مشرکین کے عہد سے بری ہیں۔ انھیں صرف چار مہینے کی مہلت ہے۔ وہ چاہیں تو مسلمان ہو جائیں یا چاہیں تو عرب سے نکل جائیں۔ اب جزیرۃ العرب دارالاسلام ہو چکا ہے اور مشرکین کا وجود یہاں غیر قانونی ہے۔ آں حضرتؐ نے ان آیات کے اظہار و اعلان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ یہ سورہ دراصل سورۂ انفال کا تتمہ ہے، اس لیے جنگ و صلح کے مزید احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی سورہ میں زکوٰۃ کے مصارف کا تعین کیا گیا ہے۔ اسی سورہ میں غزوہ تبوک کا بیان ہے، مسجد ضرار کا حکم ہے، حضرت کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کے توبہ کی قبولیت کی خوش خبری بھی ہے۔

آخری مکمل نازل ہونے والی سورۂ نصر ہے، جو بہ ظاہر تو مومنین کے لیے خوش خبری ہے لیکن صاحب نظروں کے لیے اس میں رسول اللہ ﷺ کی وفات حسرت آیات کی خبر ہے۔

قرآن کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کرنا نہ ممکن ہے اور نہ ہی مستحسن۔ بلکہ جمع قرآن کے سلسلے میں خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کیا جب تک کہ وہ اس کی واقعی ضرورت پر مطمئن نہیں ہو گئے۔ یہ جمع قرآن رسول کریم ﷺ کی ترتیب تلاوت کے مطابق تھی جس شکل میں کہ ہم آج اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس وقت ترتیب نزولی کے اعتبار سے کوئی جمع قرآن کی تجویز پیش کرتا تو یقیناً اس بدعت سیئہ کے لیے وہ مستحق تعزیر ہوتا۔ نزول احکام کی جو تدریج اوپر لکھی گئی وہ مفسرین کی کاوشوں (خصوصیت کے ساتھ صاحب تفہیم القرآن) پر مبنی ہے، جنھوں نے قرآن کے داخلی اشارات کے تحت یہ ترتیب قائم کی ہے۔ اب جب کہ دین مکمل ہو چکا ہے، تدریج احکام میں ہم ہدایت الٰہی کے پابند ہیں۔

باب پنجم

استخلاف

استخلاف سے مراد وہ وعدہ ہے، جو اس نے اپنے مومن بندوں سے کر رکھا ہے کہ اگر وہ اس زمین پر صالح نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے تو اللہ انھیں غلبہ عطا کرے گا۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات جان لینے کی ہے کہ اس کی حیثیت اللہ کے انعام کی ہے اور اللہ ہی اس بات کو خوب جانتا ہے کہ اس کے اس انعام کا مستحق کون ہے۔

(۱) استخلاف اللہ کا انعام ہے

اقامت دین کی کوششوں کا یہ دنیوی انعام ہے، جو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں مسلمانوں کو دینے والا ہے۔ دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنوں کو اسلام کے غلبہ کی بشارت دے رکھی ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (التوبہ:۳۳۔الفتح:۲۸۔الصف:۹)

’’وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان (باطلہ) پر غالب کردے۔‘‘

یہ آیت قرآن میں تین جگہ آئی ہے۔ دو جگہ (سورۂ توبہ میں اور سورۂ صف میں) کہا گیا ہے کہ ’’چاہے یہ بات مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو‘‘ اور ایک جگہ (سورۂ فتح میں) کہا ہے کہ ’’اللہ گواہی یا شہادت کے لیے کافی ہے۔‘‘ پھر جس بات پر اللہ کی شہادت قائم ہو اس پر شک کرنے اور مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! اس کے لیے کچھ شرائط ہیں۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ○

(آل عمران:۱۳۹)

''تم نہ سستی کرو نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم صاحب ایمان ہو۔''

اس آیت میں صاف صاف ایمان کی شرط لگا دی گئی ہے، جو ''وہن'' اور ''حزن'' کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے۔ آج اگر ہمیں ہر محاذ پر ناکامی سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے تو اس کا سبب آخر اس کے سوا کیا ہے کہ ہم (حقیقی) ایمان کی دولت سے محروم ہو چکے ہیں۔ استخلاف کی تو شرط ہی اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح رکھی ہے۔ فرماتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ وَّ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○ (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا ہے، اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں، اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کی حیات طیبہ کے زمانے میں تو یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے، لیکن آج کے زمانے میں اللہ کی یہ سنت جاریہ ہماری قوت عمل کے لیے ایک مہمیز ہے۔

اس وعدۂ استخلاف میں تعداد کی قلت یا کثرت کا بھی کوئی دخل نہیں ہے کیوں کہ اللہ خود فرماتا ہے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (البقرہ:۲۴۹)

''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔''

جالوت کے مقابلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کے لشکر کی تعداد بہت کم تھی لیکن وہی فتح یاب ہوئے اور جالوت مارا گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے کبھی کبھی دس گنا کفار پر مومنوں کو فتح نصیب فرماتا ہے:

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ (الانفال:۶۵)

''اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئیں گے، اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔ کیوں کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔''

اس معجزہ کا مشاہدہ مسلمانوں کو جنگ موتہ میں ہوا، جس میں ہرقل کی فوج کی تعداد ایک لاکھ (یا دو لاکھ) تھی اور مسلمان تعداد میں صرف تین ہزار تھے۔ لیکن زید بن حارثہؓ، جعفر طیارؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ اسلامی فوج کو عیسائیوں کے نرغہ سے اس شان سے نکال لائے کہ اعدائے اسلام کو تعاقب کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ (۱۳۷) ایسے ہی غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ مسلمان کفار کے ایک ہزار کے لشکر پر غالب آئے تھے۔ (۱۳۸) اور اگر مسلمان اپنے کو کم زور محسوس کریں تو بھی کم از کم دوگنے کفار پر تو اللہ انھیں ضرور ہی فتح یاب فرمائے گا:

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (الانفال:۶۶)

''پس اگر تم میں سے ایک سو ثابت قدم والے ہوں گے تو وہ دوسو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ایسے ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔''

اللہ چاہے تو فرشتوں کے ذریعے بھی مومنین کی مدد فرماتا ہے، جیسا کہ جنگ بدر میں اس نے کیا:

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ
رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۞ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ
تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ
اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۞ (آل عمران:۱۲۳-۱۲۵)

''آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا، حالاں کہ اس وقت تم بہت کم زور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔ اے نبیؐ! یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے۔ بے شک اگر تم ثابت قدم رہو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمھارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اسی آن تمھارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔'' (۱۳۹)

نظر بندی کر کے اور تعداد میں کمی بیشی کر کے بھی اللہ اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے:

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ
بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ (آل عمران:۱۳)

''تمھارے لیے ان دو گروہوں میں سے ایک نشان عبرت تھا جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بہ چشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دو چند ہے، مگر (نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔''

استخلاف اللہ تعالیٰ کا مومنوں کے لیے دنیا میں ایک مخصوص انعام ہے۔ اہل کتاب کے لیے اس نے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (المائدہ:۶۶)

’’کاش انھوں نے توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔‘‘

(۲) صالحین اور اشرار کے تمکن فی الارض میں فرق

ابرار کی مساعی کے نتیجے میں جب بالفعل دین قائم ہوتا ہے تو زمین پر اللہ کی رحمت برستی ہے اور نیکیوں کا دور دورہ ہوتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ۝

(الحج:۴۱)

’’یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے اختیار میں ہے۔‘‘

اس کے بالمقابل دنیوی حاکموں کا رویہ وہ ہے، جس کا مشاہدہ دنیا نے اب تک کیا ہے اور آج بھی ہم خود اس کے شکار ہیں، یہ ہے:

قَالَتۡ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَةً اَفۡسَدُوۡهَا وَ جَعَلُوۡۤا اَعِزَّةَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ یَفۡعَلُوۡنَ ۝ (النمل:۳۴)

’’(ملکہ سبا نے) کہا کہ بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔‘‘

یہ استخلاف اور تمکن فی الارض بعض انبیاء کے زمانے میں اہل ایمان کو حاصل رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا زمانہ ایک مثالی زمانہ تھا۔ آج بھی وہ زمانہ واپس آ سکتا ہے بہ شرطے کہ دعوت دین میں انبیائی طریق کار کو اپنایا جائے۔

باب ششم

جہاد

عہد نبوی میں مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام و بقا میں جہاد کا کردار

جہاد کی تعریف

جہاد کا مادہ ج ہ د ہے، جو باب فتح اور سمع دونوں سے آتا ہے۔ باب ف سے اس کے معنیٰ ہیں 'پوری کوشش کرنا۔ سعی بسیار کرنا'۔ باب مفاعلہ سے اس کا مصدر بنتا ہے مجاہدہ اور جہاد۔ اس کے معنیٰ بھی وہی ہونے ہیں۔ لیکن اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ دین کی حفاظت اور اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ افتعال کے وزن پر اسی مادہ سے اجتہاد کا لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ بھی کسی امر میں پوری کوشش صرف کرنا ہے۔ لیکن یہ لفظ اب فقہ کی ایک اصطلاح بن گیا ہے، جس کا مطلب نصوص کی غیر موجودگی میں کسی مساوی یا ملتے ہوئے نص پر قیاس کرتے ہوئے کوئی حکم لگانا ہے۔

قرآن میں جہاد کا مفہوم

یوں تو انسان کی پوری زندگی ہی جہاد اور مجاہدہ سے عبارت ہے لیکن اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمان کی پوری زندگی کو مقدس بنا دیا ہے:

وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج:۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں کوشش کرتے رہو، جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔''

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (العنکبوت:۶۹)

''جو ہماری رضا اور خوش نودی کی طلب میں سعی بسیار کرے گا ہم اسے ہدیت کا راستہ دکھلائیں گے۔''

پھر اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَ مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ط (العنکبوت:۶)

''جو اللہ کی راہ میں جدو جہد کرے گا وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے کرے گا۔''

اس کے بعد حکم ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ (المائدہ:۳۵)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے لیے وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں سعی بسیار کرتے رہو۔''

لیکن جہاد کا لفظ قرآن کریم میں بہ کثرت مقامات پر واضح طور سے قتال فی سبیل اللہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے لیے کہیں جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور کہیں صرف جہاد ہی سے قتال فی سبیل اللہ مراد لی گئی ہے۔

اول کی مثال

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لا اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ط (البقرہ:۲۱۸)

''اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ رحمت الٰہی کے طلب گار ہیں۔''

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ لا اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ط (التوبہ:۲۰)

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے نزدیک وہ عالی مقام ہیں۔''

دوم کی مثال

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ○ (آل عمران:۱۴۲)

''کیا تم گمان کر بیٹھے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ اللہ نے تو ابھی تک جانا ہی نہیں ہے کہ تم میں سے کس نے جہاد کیا ہے اور کس نے صبر سے کام لیا ہے۔'' (۱۴۰)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ (الانفال:۷۵)

''وہ لوگ جو بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ جہاد میں حصہ لیا یہ لوگ بھی تمھیں میں سے ہیں۔''

اسلام کے قیام و بقا اور توسیع میں جہاد ہی کی کارفرمائی رہی ہے۔لیکن یہ جہاد Crusade (مذہبی جنگوں) کے معنوں میں نہیں ہے جیسا کہ مخالفین اور معاندین اسلام نے باور کرا رکھا ہے اور اسلام پر طعن کرنے کے لیے بہ طور گالی کے اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ جہاد ایک وسیع الاطراف لفظ ہے، جہاد بالسیف جس کا صرف ایک جزو ہے۔ دراصل پوری زندگی جہاد ہی سے عبارت ہے۔اور اگر زندگی کو اللہ کے احکام کا تابع کر دیا جائے تو پوری زندگی جہاد کا ثواب مل سکتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے فکر و عمل کو جہاد زندگانی سے تعبیر کیا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم   جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

رسول اکرم ﷺ نے نفس کے جہاد کو جہاد اکبر کا نام دیا ہے۔(۱۴۱)

ہجرت اور اس سے پیدا شدہ مسائل کا حل

حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ میں رسالت کے تیرہ سال گزارے۔اس زمانے میں یمن کے علاوہ جزیرۃ العرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی، لیکن خانۂ کعبہ کی مرکزیت کی وجہ سے مکہ میں مختلف خاندانوں نے عوامی ضروریات کے تحت ذمے داریاں تقسیم کر رکھی تھیں۔ان میں قصی کا مرتبہ سب سے اعلیٰ تھا کیوں کہ حجابہ، سقایہ، رفادہ، ندوہ اور لواء سب اسی سے متعلق تھے۔(۱۴۲) یہ تمام خدمات بہ جائے خود ایسی عالی مرتبت تھیں کہ ابنائے قصی کو عملاً مکہ کی سرداری

حاصل ہو چکی تھی۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کو نبوت حاصل ہونے کے بعد اہل ایمان کے سامنے اطاعت کا مسئلہ آگیا جو کہ اللہ اور رسولؐ کے لیے خاص تھا۔ لیکن شوکت اور قوت سے محروم ہونے کے باعث مسلمان غربت اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ ان کا سوشل بائیکاٹ بھی کیا گیا اور وہ شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔ (۱۴۳) انھیں دوبار حبشہ بھی ہجرت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔

ہجرت مدینہ تاریخ اسلامی کا اہم ترین سنگ میل ہے کیوں کہ یہیں سے اسلام کی شوکت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ مبارک سفر ہے، جس میں قوانین جہاد کی پہلی دفعہ مرتب ہوئی جب سراقہ بن مالک بن جعشم کو تحریری امان نامہ دیا گیا۔ (۱۴۴) اس سے قبل آپ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر یثرب (مدینہ) میں بارہ نقیب مقرر فرما چکے تھے جو دارالہجرۃ میں مستقبل کی اسلامی حکومت کے امین تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے اوس اور خزرج کی باہمی دشمنی اور ایک دوسرے کے خون کی پیاس ختم ہو چکی تھی۔ مکہ سے آپؐ اور آپ کے اصحاب کی ہجرت کفار مکہ کے عزائم پر ایک کاری ضرب تھی۔ اسے باعث ذلت سمجھا گیا اس لیے انھوں نے قسمیں کھالیں کہ وہ ہادی اسلامؑ اور مسلمانوں کو فنا کے گھاٹ ہی اتار کر دم لیں گے۔ آں حضور ﷺ ان خونخوار وحشیوں کی غارت گرانہ عادت سے بہ خوبی واقف تھے۔ حزم واحتیاط کا تقاضا تھا کہ دشمن کی حرکات وسکنات کی خبر رکھی جائے۔ ان کی فوجی تیاریوں اور تدابیر جنگ کو نگاہ میں رکھا جائے اور ان کے تدارک کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اس ذیل میں آپؐ نے جو اہم کام کیے وہ سب دفاع ہی کے تحت آتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند کاموں کا جائزہ لیں گے۔

۱۔مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ (مواخاۃ) کا قیام

مہاجرین کا مسئلہ ہر زمانے میں نہایت اہمیت کا موضوع رہا ہے۔ آج کل اس مقصد کے لیے الگ وزارتیں قائم ہوتی ہیں۔ اقوام متحدہ کا تو ایک باقاعدہ شعبہ ہی اس مقصد کے لیے کام کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مہاجرین اور انصار میں مواخات کرائی۔ اب انصار کے دو قبائل اوس اور خزرج کے ساتھ مکہ کے مہاجرین مل کر ایک قبیلہ بن چکے تھے اور افرادی قوت کے ساتھ دفاعی قوت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

۲-تعمیر مساجد

آپ نے اقامت صلوٰۃ کے لیے پہلی مسجد قبا میں تعمیر کی۔ پھر قبیلہ بنی نجار میں مرکزی مسجد تعمیر ہوئی، جو مسجد نبوی کے نام سے دنیائے اسلام کی تین مقدس مساجد میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق کے بہ موجب یہ مسجد پہلے سے قائم شدہ ایک مسجد کی توسیع تھی کیوں کہ دعاۃ کی کوششوں سے ہجرت سے پہلے مدینہ میں نو مساجد تعمیر ہو چکی تھیں۔ (۱۴۵)

۳-دفاعی حکمت عملی

تیسرا کام جو آپؐ نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد کیا سیاسی نوعیت کا تھا۔ آپؐ نے مدینہ اور اطراف کے قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدات کیے۔ اس زمانے میں شہر مدینہ میں یہود کے تین قبیلے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ خصوصیت سے آباد تھے۔ ان کے علاوہ ایک قبیلہ بنو ثعلبہ کا بھی تھا۔ یہود کی بستیاں اور قلعے شمال میں خیبر تک چلے گئے تھے۔ آپؐ نے ان تمام قبائل کو معاہدات میں شامل کر کے انھیں ایک دفاعی لڑی میں پرو دیا۔ ان معاہدات کے الفاظ حدیث اور سیر کی کتابوں میں بحمد اللہ محفوظ ہیں۔ (۱۴۶) آپؐ نے قبائل کو ہم نوا بنانے کے لیے شمال میں قبیلہ جہینہ کی طرف اور اسی طرح بقیہ اطراف میں دیگر قبائل کا دورہ کیا اور الحمد للہ سبھوں سے دفاعی معاہدات کرنے میں کام یاب رہے۔

۴-جاسوسی نظام کا قیام

اسلامی ریاست پر اہل مکہ کی تر کتازیوں کے خلاف آپؐ نے جاسوسی کا وسیع نظام قائم کیا، جس کے لیے ایک سے زیادہ ذرائع استعمال فرمائے۔ اس کی دل چسپ مثالیں ہمیں غزوۂ بدر کی ابتدا میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بلاشبہ غزوات میں مسلمانوں کی کام یابیاں رسول اللہ ﷺ کی فراست جنگی کی بھی مرہون منت تھیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو: آپؐ کے پاس ایک بدو لایا گیا۔ وہ قریش کی فوج کی تعداد نہیں بتا سکا لیکن مزید استفسار پر اس نے بتلایا کہ ان کے کھانے کے لیے ایک دن نو اونٹ اور دوسرے دن دس اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ آپ نے فوراً حساب لگا لیا کہ ان کی تعداد ساڑھے نو سو ہے۔ مزید براں آپؐ کو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ اور ابوجہل کے لشکر کی پوری

خبر رہتی تھی۔ غزوۂ احزاب کے موقعے پر خندق کھود کر مدینہ کو محفوظ کر لینا اسی جاسوسی کی وجہ سے ممکن ہوسکا تھا۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں بدر، احد، احزاب اور خیبر وغیرہ کی جنگوں کی پوری تفصیلات محفوظ ہیں۔ افسوس کہ آج کی دنیا میں یہ نظام یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس پہنچ گیا ہے اور مسلمان بالکل مفلس اور تہی دست ہو کر رہ گئے ہیں۔

۵۔ قریش کی تجارتی ناکہ بندی

اگرچہ آپؐ خود مدینہ جیسی چھوٹی سی جگہ میں محصور تھے لیکن آپؐ کو قریش کی اس کم زوری کا علم تھا کہ ان کی معیشت کا دارومدار تجارت پر ہے۔ چناں چہ گرمیوں میں ان کا سفر شام اور فلسطین کی طرف ہوا کرتا تھا اور سردیوں میں یمن کی طرف جیسا کہ اللہ نے قرآن میں بتلایا ہے۔ (۱۴۷) چناں چہ آپؐ نے ان کی معیشت پر ضرب لگانے کی خاطر تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کی۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ جنگ بدر سے پہلے قافلہ قریش کی آپؐ نے سات مرتبہ ناکہ بندی فرمائی تھی۔ (۱۴۸) جنگ بدر کے موقعے پر ابوسفیان کا قافلہ بھی اپنی جاسوسی کی صلاحیت کی بنا پر بچ کر نکل گیا تھا۔ قرآن کہتا ہے:

وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ط (الانفال:۴۲)

''اور قافلہ تمھارے زیریں جانب تھا۔''

معاشی ناکہ بندی کا عمل آج کے زمانے میں بھی جاری ہے لیکن اس ترقی یافتہ دنیا میں انسانی جان کی کوئی حرمت اور قیمت نہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے مسلم ممالک پر معاشی تحدیدات عائد کر کے لاکھوں آدمیوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا اقوام مغرب کے لیے اقوام متحدہ کا ایک انعام ہے۔

۶۔ فوجی رازداری کا اہتمام اور کشت وخون سے گریز

جہاں دشمنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے جاسوسی کا نظام قائم تھا وہیں اپنی فوجوں کے بارے میں مکمل رازداری آپؐ کی فوجی حکمت عملی تھی۔ چناں چہ فتح مکہ کے وقت اہالیان شہر کو اس وقت تک اس کا علم نہیں ہوسکا جب تک اسلامی فوجوں نے اطرافِ مکہ کے ٹیلوں پر قبضہ نہیں کر لیا۔ ابوسفیان اس وقت مسلم فوجوں کی تحویل میں تھا۔ اس کی وجہ سے انسانی

اتلاف جان نہیں کے برابر ہوا۔ ابوسفیان کو جانے کی اجازت اسی لیے نہیں دی گئی کہ اس کی واپسی زیادہ کشت وخون کا سبب بن سکتی تھی۔

۷۔ دشمنان دین کے لیے عام معافی کا اعلان

آپ کا کام کشت وخون برپا کرنا نہیں تھا بلکہ لوگوں کو راہ حق دکھانا تھا، جیسے ہی آپ نے عام معافی کا اعلان کیا مکہ کی پوری آبادی اسلام لانے کے لیے ٹوٹ پڑی۔ اگر مکہ جنگ کے ذریعے فتح ہوتا تو ہوسکتا ہے اس سے انتقام کی پیاس قدرے بجھ جاتی لیکن دعوت دین کا کام نہ ہوسکتا۔

۸۔ الحرب خدعة

آپ کی مشہور حدیث ہے: اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ، (۱۴۹) ''جنگ دھوکہ کا نام ہے۔'' اس کے تحت آپ نے غزوہ خندق کے موقعے پر یہود بنی قریظہ اور اہل مکہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کرنے کی اجازت دی، جس کی وجہ سے ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور بالآخر اہل مکہ کے واپس جانے کے فوراً بعد بنو قریظہ سے عہد شکنی کا انتقام لیا گیا اور ان کے تمام جنگی مرد قتل کیے گئے۔

۹۔ جنگی تدابیر

جنگی تدابیر کے ذیل میں آپ چند باتوں کا لحاظ فرماتے تھے: (۱) بلندی کی جگہ تاکہ دشمن فوج کی نقل وحرکت سامنے رہے اور اپنی فوجوں کو مناسب حرکت دی جاسکے۔ (۲) چشمۂ آب تک رسائی، جیسا کہ جنگ بدر کے موقعے پر کیا گیا۔ (۳) محفوظ میدان تاکہ فوجوں کو نقل وحرکت کی سہولت رہے۔ (۴) سورج کے مقابل رخ تاکہ سورج کی کرنیں آنکھوں کو چکاچوند نہ کرسکیں اور دشمن اس فائدہ سے محروم رہے۔ (۵) جنگ کی ابتدا کرنے کے لیے صبح کا انتخاب تاکہ فوجیں تروتازہ میدان میں اتریں۔ مزید یہ کہ صبح کے وقت مسلمان اللہ کو خصوصیت کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ (٦) کمزور جگہ کی ناکہ بندی، جیسا کہ احد میں جبل رماۃ پر تیراندازوں کا دستہ متعین کرکے کیا گیا۔ (۷) فوج کے لیے محفوظ جگہ کا انتخاب، جیسا کہ بدر اور احد دونوں جنگوں میں پہاڑی قوسوں کے درمیان اپنی فوجوں کو جمایا گیا۔ (۸) ہوا کے مناسب رخ پر قیام۔

۱۰-اعداء اسلام کی دل جوئی - رحمت عالمؐ کا اسوہ

تالیف قلب، شہادت حق کا ایک جز ہے۔ جنگ خندق میں عرب کے تمام قبائل پسپا ہو کر واپس گئے تھے۔ اس کے بعد عرب میں زبردست قحط پڑا تھا، یہاں تک کہ مکہ میں فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ اس وقت سوائے نجد کے کہیں غلہ نہیں تھا۔ لیکن چوں کہ وہاں کے رئیس ثمامہ بن اُثال مسلمان ہو گئے تھے، انھوں نے مکہ والوں کو غلہ کی فراہمی روک دی تھی۔ ابوسفیان نے قرابتی حقوق کا واسطہ دے کر آپؐ سے درخواست کی کہ غلہ کی فراہمی بحال کر دی جائے۔ نبی رحمت ﷺ نے اہل مکہ کی تالیف قلب کے لیے نہ صرف غلہ بھجوایا بلکہ پانچ سو اشرفیوں کی امداد بھی بھجوائی تاکہ مکہ کے غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔ (۱۵۰) اس نیکی کا اثر ابوسفیان اور اہل مکہ پر یقیناً پڑا ہوگا۔

اسلامی کاز کے لیے لڑی جانے والی جنگ کے مقاصد

مدینہ میں قیام کے ابتدائی پانچ سالوں میں رسول اللہ ﷺ کو بار بار اعدائے اسلام کی فوج کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی کبھی اسلامی لشکر بھی احتیاطی تدبیر کے طور پر باہر نکلتا تھا، یہاں تک کہ غزوۂ احزاب (۵ھ) کے خاتمے پر آپ نے اعلان فرمایا: **الآن نغزوهم ولا يغزونا نحن نسير اليهم** ۔ ''اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے۔ وہ ہم پر چڑھائی نہ کریں گے۔ اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔'' (۱۵۱) ان جنگوں میں اور مابعد پیش آنے والی جنگوں میں جن میں حضور ﷺ نے خود شرکت فرمائی ہے انھیں سیرت نگاروں نے غزوہ کا نام دیا ہے، اور جن میں آپؐ کی شرکت نہیں ہوئی انھیں سریّہ کہا گیا ہے۔ یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ ان بزرگوں نے ان لڑائیوں کو جہاد کا نام نہیں دیا، اگرچہ ان جنگوں کی اجازت اللہ تعالیٰ نے احکام جہاد ہی کے تحت دی تھی۔ اس لیے ان غزوات و سرایا کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کا تعین کر لیا جائے کہ اسلامی جنگ کے مقاصد کیا ہیں۔

قرآن اور سیرت کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام میں اقدامی جنگ کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ جہاں مسلمان نہ بستے ہوں وہاں اسلامی حکومت قائم ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں کیوں کہ اسلامی احکام مسلمانوں پر نافذ ہوتے ہیں، غیر مسلموں پر نہیں۔ اسلامی نظام دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ یہ استعمار یا سامراجیت نہیں ہے۔ روم اور ایران سے

مسلمانوں کی جنگیں بھی اقدامی نوعیت کی نہیں تھیں جیسا کہ آگے آئے گا۔ جنگ کی جتنی بھی صورتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں مدینہ کے ماحول میں ان سب کو دفاعی جنگ سے ہی موسوم کیا جائے گا۔ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جنھیں اقدام کے لیے مثبت دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا مقصد وجود بتلایا گیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جنھیں لوگوں سے الگ کیا گیا ہے کیوں کہ تم معروفات کا حکم دیتے ہو اور منکرات سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

نیکی کا حکم دینا تو بہ طور وعظ و نصیحت کے بھی ہو سکتا ہے لیکن منکرات سے روکنے کے لیے قوت درکار ہے۔ اسی لیے آپؐ نے ایک حدیث میں حکم دیا ہے:

مَنْ رَّاٰمِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ وَ اِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَ اِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔ (۱۵۲)

''تم میں سے جو شخص کوئی برا کام دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے بہ زور وقوت روک دے، اگر یہ نہ کر سکے تو زبان سے منع کرے اور اگر اس کی بھی قوت اسے حاصل نہ ہو تو چاہیے کہ اسے دل میں برا سمجھے، لیکن یہ ایمان کا کم زور ترین درجہ ہے۔''

یہ حکم بہت تاکیدی ہے۔ قرآن میں اس سلسلے میں بنی اسرائیل کے تین گروہوں کی مثال دی گئی ہے جن میں سے ایک سنت کے احکام کو توڑنے کا مجرم تھا، دوسرا فریضہ نہی عن المنکر ادا کرتا تھا اور تیسرا دوسرے گروہ کو اس فریضہ کی ادائی سے روکتا تھا۔ پہلے گروہ کو دردناک عذاب (عَذَابٍ بَئِيْسٍ) نے آلیا تھا۔ دوسرے گروہ کو اللہ نے بچالیا تھا۔ اور تیسرے کے بارے میں اگرچہ قرآن خاموش ہے لیکن مفسرین کا گمان ہے کہ شاید یہ گروہ بھی مبتلائے عذاب ہوا تھا۔ (۱۵۳) ایک حدیث میں نہی عن المنکر سے غافل گروہ کو جہاز کے پیندے میں سوراخ کرنے والوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو بہ شمول خود پورے جہاز کی غرقابی کا سبب بنتا ہے۔ (۱۵۴)

(۲) دفع فتنہ

اس کا حکم اللہ نے اس طرح دیا ہے:

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ

(البقرہ:۱۹۳)

''اور انھیں قتل کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔''

اور فتنہ کے بارے میں پہلے ہی ارشاد ہو چکا ہے:

وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ (البقرہ:۱۹۱)

''اور فتنہ قتل سے بھی شدید تر ہے۔''

لیکن یہ دونوں صورتیں بھی اقدامی جنگ کو ثابت نہیں کرتیں۔ نہی عن المنکر دراصل اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ عامۃ المسلمین کے لیے اس حدیث نے تین درجے مقرر کر دیے ہیں۔ دفع فتنہ کی کوششیں منکرات تک محدود نہیں ہیں بلکہ شورش اور ہنگامہ یا فساد فی الارض کو بھی محیط ہیں، جیسا سورۂ انفال میں بھی بیان ہے۔ قرآن کریم میں متعدد دوسری جگہوں پر کہیں وضوح اور کہیں اشارے ہیں لیکن دراصل یہ بیان جنگ کے طریق کار کے وضوح کی خاطر ہے یعنی جب جنگ شروع ہی ہو جائے تو دشمن کو اچھی طرح کچل دو:

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝

(الانفال:۱۲)

''ان کی گردنوں پر وار کرو اور جوڑ جوڑ پر مارو۔''

دراصل جنگ میں تمھارا طرز عمل یہ ہونا چاہیے:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۫ (محمد:۴)

''جب اہل کفر سے مڈبھیڑ ہو تو تمھارا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب خوب

خون بہا لو تو اسیروں کو مضبوطی سے باندھو، پھر خواہ انھیں احسان کرتے ہوئے رہا کردو یا فدیہ لے کر رہا کرو یہاں تک کہ جنگ اپنے اوزار رکھ دے۔''

یہ فعل بھی میدان جنگ سے متعلق ہے اور دفع فتنہ کی خاطر حکم دیا گیا ہے کہ ائمۃ الکفر کو ٹھکانے لگا دو:

فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ (التوبہ:۱۲)

''کفر کے سرداروں کو قتل کردو۔''

چناں چہ جنگ بدر میں اسی حکم پر عمل کرتے ہوئے تمام سرداران قریش کو میدان جنگ ہی میں قتل کردیا گیا تھا۔ بلکہ خاطر خواہ خون ریزی کر لینے سے پہلے گرفتاریاں شروع کردینے پر اللہ کا عتاب بھی آیا تھا۔ (۱۵۵) رسول اللہ ﷺ نے جنگ کو اسی لیے تنور کی بھٹی سے تشبیہ دی ہے: حَمِيَ الْوَطِيْسُ (۱۵۶) ''بھٹی گرم ہوگئی یعنی جنگ شباب پر آگئی۔'' مولانا مودودیؒ نے اسی لیے ان دونوں صورتوں کو مصلحانہ جنگ میں شمار کیا ہے۔ (۱۵۷) واضح رہے کہ 'الجہاد فی الاسلام' میں جو جہاد کے موضوع پر ایک مکمل اور سیر حاصل بحث پر مبنی کتاب ہے، اقدامی جنگ کا کوئی باب نہیں ہے۔

دفاعی جنگ کے اسباب

مدافعانہ جنگ کی جو صورتیں قرآن کریم کے نصوص سے ثابت ہوتی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) ظلم وتعدی کا استیصال

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (البقرہ:۱۹۰)

''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور ظلم وتعدی مت کرو۔ بے شک اللہ ظلم وتعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت میں کفار کی جنگ کو تعدی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا...... اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ (الحج:۳۹،۴۰)

''جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے ان کو جنگ کی اجازت دے دی گئی کیوں کہ ان کے اوپر ظلم ڈھایا گیا ہے...انھیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔''

سورۂ بقرہ کی آیت میں تعدی اور سورۂ حج کی آیات میں ظلم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(۲) راہ حق کی حفاظت

اسلام ایک صالح طریق فکر اور اس پر گام زن ہونے کا نام ہے۔ یہی فکر و عمل بندۂ خدا کے لیے مومن بننے کی ضمانت ہے۔ اس لیے اس طریق فکر کی حفاظت اور اشاعت ایک مومن کی ذمہ داری ہے۔ جب اس طریق فکر پر کہیں سے آنچ آئے تو اس سے دفاع مومن کا حق بھی ہے اور اس کی ذمے داری بھی۔ اگر وہ اس کام سے پہلو تہی کرے گا تو اس کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ مکہ سے مسلمانوں کی ہجرت کا سبب (اور اصحاب کہف کا غار میں پناہ لینا) اسی حق کی پامالی تھی۔ لیکن قریش مکہ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اسلام کا راستہ روکنے اور اسے مٹا ڈالنے کے لیے بار بار مدینہ کی اسلامی حکومت پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اللہ نے اسی کا نقشہ کھینچا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط فَسَیُنْفِقُوْنَھَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْھِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ۵

(الانفال:۳۶)

''جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے، مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لیے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے راہ حق سے روکنے والوں سے نہ صرف جنگ کی اجازت مرحمت فرمائی ہے بلکہ جنگ کا فیصلہ بھی سنا دیا ہے۔

(۳) دغابازی اور عہد شکنی کی سزا

صلح حدیبیہ ۶ھ میں واقع ہوئی۔ اس کی شرائط میں ایک دفعہ یہ تھی کہ فریقین دس سال

تک آپس میں جنگ نہ کریں گے اور دوسری دفعہ یہ تھی کہ مکہ کے قبائل ان دونوں فریقوں میں سے جس کے ساتھ عہد و پیمان میں شامل ہونا چاہیں شامل ہو سکتے ہیں۔ یہ پیمان صلح ان کے اوپر بھی نافذ ہوگا۔ لیکن قریش مکہ نے غدر کر کے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا اور خزاعہ پر حملہ کرنے والے بنوبکر کی ہتھیاروں اور افراد سے مدد کی۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے بہ حکم الٰہی مکہ پر چڑھائی کی اور اسے بہ زور فتح کرلیا۔ اس کا ذکر قرآن میں یوں ہے:

اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ○ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ○ (الانفال: ۵۶، ۵۷)

''ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ اس کو ہر موقع پر توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔ پس اگر یہ لوگ تمھیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں، ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ساتھ ہی ایک اصول بھی مقرر کر دیا:

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۠ (الانفال: ۵۸)

''اور اگر کبھی تمھیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدہ کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس حکم پر عمل آوری کے لیے اللہ نے چار مہینہ کا الٹی میٹم کا وقت مقرر کر دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ؕ○ فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِی الْكٰفِرِیْنَ ○ (التوبہ: ۱، ۲)

''اعلان براءت ہے اللہ اور رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو اور یہ کہ اللہ منکرِ حق کو رسوا کرنے والا ہے۔''

(۴) اندرونی دشمنوں کا استیصال

دفاعی جنگ کی یہ تین صورتیں بیرونی دشمنوں کے لیے تھیں۔ لیکن چوں کہ مسلمانوں کو اندرونی دشمنوں سے بھی سابقہ پڑتا رہتا ہے اس لیے ان سے نپٹنے کی بھی اللہ نے گنجائش رکھی ہے۔ یہ بھی اسلامی حکومت کا حق دفاع ہے۔ ہم آگے چل کر مغربی قوموں کے کردار کا رسول اللہ ﷺ کے عملی کردار سے بھی موازنہ کریں گے کہ کس طرح یہ قومیں اس حق کا استعمال نہیں بلکہ استحصال کر رہی ہیں۔ مدینہ میں مسلمانوں کے دشمن یہود ہی نہیں تھے بلکہ منافقین بھی تھے۔ ان کی تاریخ تو اس زمانے سے لے کر آج تک پھیلی ہوئی ہے۔ منافقین وہ لوگ تھے جو 'کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو' کی لعنت میں گرفتار تھے۔ ان کا ایمان حقیقی نہیں بلکہ ظاہر داری کا اور عمل اخلاص کی نیت سے نہیں بلکہ ریاکاری پر مبنی تھا۔ اندر ہی اندر یہ مسلمانوں کی جڑ کھودنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اللہ نے ان کے لیے واضح احکام دیے ہیں۔ اسے ہم 'اندرونی دشمنوں کا استیصال' کا عنوان دے سکتے ہیں۔ دفاع کے معاملے میں اللہ ان کو کفار کے مساوی قرار دیتا ہے۔ حکم ہوا ہے:

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط
وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ط وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (التوبہ: ۷۳)

''اے نبیؐ! کفار اور منافقین کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ آخر کار ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔''

(۵) امن وامان کا قیام

داخلی فتنوں میں لٹیرے، ڈاکو اور باغی شامل ہیں، جو امن وامان کو غارت کر کے اسلامی حکومت کو فتنہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ قرآن اس حرکت کو اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کے مترادف قرار دیتا ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اللہ نے ان سے بھی مقابلہ کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ رعایا امن وسکون کے ساتھ رہے۔ لیکن بیرونی دشمنوں کے برخلاف

انھیں توبہ کرنے کا موقع حاصل ہے بہ شرطے کہ اسلامی لشکر کے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے انھیں عقل آجائے۔ارشاد باری ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(المائدہ:۳۳،۳۴)

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کردیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر (اس سے مستثنیٰ وہ لوگ ہیں) جو توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

(۶) مظلوم مسلمانوں کی حفاظت

اسلام پوری انسانیت کا دین ہے۔ یہ کسی پر بہ جبر نافذ نہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ:۲۵۶)

''دین میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔''

لیکن ایمان لانے کے بعد دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی رسی میں پرو دیے جاتے ہیں۔ یہ حبل اللہ کی رسی ہے اور اس رسی کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اللہ کا حکم ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝ (النساء:۷۵)

''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔''

اللہ کا یہ حکم اسلامی حکومت کو اختیار دیتا ہے کہ اگر مسلمان کسی ملک میں ذلت کی زندگی گزار رہے ہوں اور وہاں انھیں اپنے ایمان اور جان و مال اور آبرو کا خطرہ لاحق ہو تو ان کی مدد کے لیے پیش قدمی کی جا سکتی ہے اور اسے دفاع ہی گردانا جائے گا۔ (۱۵۸) صدر اسلام کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ ایران کی جنگ کا سبب کسریٰ کا جبر، استبداد اور استحصال تھا، جس کی چکی میں ملک کے عوام کے علاوہ عراق کی عرب رعایا بھی پس رہی تھی اور ایران اپنی خانہ جنگی کے باوجود خود کو اتنا قوی محسوس کرتا تھا کہ اپنی رعایا کو حسب خواہش قابو میں رکھ سکے۔ روم کی سلطنت اسلامی حکومت کو خطرہ محسوس کرتی تھی، اس لیے شام کی جنگوں میں ابتدا رومیوں ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس طرح یہ تمام ہی جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں۔

ہمارے زمانہ میں جنگ کی فتنہ سامانیاں اور ہلاکت خیزیاں عروج پر ہیں۔ یہ تمدن و تہذیب کا زمانہ کہلاتا ہے اور غالب قوموں کا معیار امن و جنگ انسانیت کا پیمانہ بن چکا ہے۔ لیکن یہ قومیں جب اور جس کے خلاف چاہتی ہیں جنگ چھیڑ دیتی ہیں۔ ان طاقتوں نے امن کے قیام کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کر رکھا ہے، جس کا نام اقوام متحدہ ہے۔ پہلے اس کی جگہ ایک دوسرا ادارہ تھا جو 'مجلس اقوام' کہلاتا تھا۔ جس کے بارے میں حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند   بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

(میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ کچھ کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنالی ہے)

موجودہ اقوام متحدہ بھی اسی کی جانشینی کر رہی ہے۔ اس کی ناک کے نیچے اتنی جنگیں ہو چکی ہیں اور اتنے افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں کہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے تب سے اب تک جنگوں میں اتنے افراد ہلاک نہ ہوئے ہوں گے۔ امریکہ اور برطانیہ نے حفاظت خود اختیاری کے لیے اقدامی پیش بندی (Pre Emptive Strike) کی اصطلاح وضع کر لی ہے۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں اور افغانستان و عراق کی حالیہ جنگوں تک کم از کم ایک کروڑ جانیں ان طاقتوں کی عدل گستری کی ممنون کرم ہیں۔ اس تناظر میں جب رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں پیش آمدہ جنگوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے کہ اتنے قلیل اتلاف جان کے ساتھ ایک معرکۃ الآرا تہذیب روئے زمین پر نمودار ہوگئی اور ایک صدی کے اندر اندر نصف دنیا پر اس کا قبضہ و تسلط ہو گیا۔ یہاں نہ کوئی استعماریت تھی، نہ کوئی استحصال تھا۔ مقام تأسف ہے کہ ایسے پرامن انقلاب کو وہ لوگ خونیں انقلاب کا نام دیں، جن کے دامن سے اس وقت بھی لہو ٹپک رہا ہے۔

اسلامی جنگوں کا شاندار ریکارڈ

یہ مسلمان علماء کا احسان اور سیرت نبوی کا اعجاز ہے کہ آپؐ کے زمانے میں جتنی جنگیں ہوئیں ان کا تفصیلی ریکارڈ ہمارے سامنے موجود ہے۔ مسلمانوں کو مدینہ سے کتنی بار نکلنا پڑا یا وہ خود نکلے ان سب کی مجموعی تعداد بیاسی (۸۲) ہوتی ہے۔ سیرت نگاروں نے اس کی پوری تفصیلات بھی مہیا کی ہیں یعنی مقابل فریق کا نام، دونوں فریقوں کی تعداد، مقابلہ یا مہم کی نوعیت، نتیجہ اور قتل و گرفتاری وغیرہ کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ (۱۵۹) اس سلسلے میں قاضی سلیمان منصور پوریؒ نے پورے دور رسالت کے مسلمان شہداء کے نام تک تمام مصادر کو کھنگال کر اکٹھا کر دیا ہے۔ (۱۶۰) جو لوگ الزام رکھتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے وہ ان بیاسی جنگوں میں مجروحین، مقتولین اور قیدیوں کی تعداد نوٹ فرمالیں۔

نام فریق	اسیر	زخمی	مقتول	کل	کیفیت
مسلمان	۱	۱۲۷	۲۵۹	۳۸۷	ہر دو جانب کے زخمیوں کی تعداد صحیح نہیں
مخالف	۶۵۶۴		۷۵۹	۷۳۲۳	
میزان	۶۵۶۵	۱۲۷	۱۰۱۸	۷۷۱۰	اسیروں اور مقتولوں کی تعداد ان شاء اللہ صحیح ہے (۱۶۱)

مخالفین کے اسیروں کی سب سے بڑی تعداد جنگ حنین سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ جنگ فتح مکہ کے

بعد لڑی گئی تھی اور دشمنوں کے چھ ہزار آدمی قید ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ کو حق قرابت کی بنا پر اور کچھ کو فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا تھا۔ مجموعی طور سے مدینہ کے دس سالہ دور نبوت میں ۶۳۴۷ قیدیوں کو از راہ لطف و کرم بلا کسی شرط کے آزاد کیا گیا تھا۔ صرف دو قیدی ایسے تھے جو اپنے سابقہ جرائم کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ دو سو پندرہ قیدیوں کی شرائط آزادی کی ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا امکان ہے کہ وہ مسلمان ہو کر اسلامی معاشرہ میں جذب ہو گئے ہوں۔ مقتولین کی مذکورہ ۱۰۱۸ کی تعداد کا جو مدنی دور نبوت کے دس سالوں پر محیط ہے گزشتہ صدی کی دو عظیم جنگوں اور امریکہ و برطانیہ کی مسلمانوں کے خلاف چھیڑی گئی حالیہ جنگوں میں عام افراد کی ہلاکتوں سے مقابلہ کیجیے تو اس دور میں اپنے پیدا ہونے پر شرم آتی ہے۔ عراق کی پہلی جنگ میں امریکہ نے شہریوں کی ایک زمین دوز پناہ گاہ (Bunker) کے اندر جان بوجھ کر ایک میزائل چھوڑ کر اس سے زیادہ آدمیوں کو بھون ڈالا تھا جتنے آدمی پورے دور رسالت میں مقتول نہیں ہوئے تھے۔

واضح رہے کہ مسلمان مقتولین کی ایک بڑی تعداد جنگ احد میں شہید ہوئی تھی۔ مسلمان شہداء کی تعداد اس جنگ میں ستّر اور زخمیوں کی تعداد چالیس تھی۔ اس کے برخلاف کفار مکہ کے مقتولین کی تعداد صرف تین تھی۔ مسلمانوں کا دوسرا سب سے بڑا جانی نقصان سریہ بئر معونہ میں ہوا تھا۔ جب انہتر (۶۹) علماء اور حفاظ مظلومانہ شہید کر دیے گئے تھے۔ دراصل یہ جنگ تھی ہی نہیں بلکہ عامر بن مالک کی فرمائش پر ستّر مسلمانوں کا ایک وفد تبلیغ و تعلیم کی غرض سے اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ عامر غداری کر کے قبائل رَعل و ذکوان اور بنو سلمہ کو چڑھا لایا اور ایک کے سوا سب شہید کر دیے گئے۔ واقعہ رجیع میں بھی دس واعظین کو شہید کیا گیا۔ یہ بھی جنگ نہیں تھی۔

اس بیاسی (۸۲) کی تعداد میں اصل جنگیں تو چند ہی ہیں۔ لیکن مدینہ سے باہر نکلنے کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض سرایا محض سفر اور دشمنوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے تھیں جیسے سریۂ سیف البحر، رابغ، ضرار اور نخلہ وغیرہ۔ بعض تبلیغ کے لیے تھیں جیسے ودّان ہے یا دودن! بواط اور ذو العشیرہ۔ اسی ذیل میں رجیع اور بئر معونہ کو بھی شمار کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کے بعض اسفار غداروں یا ڈاکوؤں کی بیخ کنی کے لیے تھے جیسے غزوہ سفوان اور غزوہ کرز بن جابر فہری، ذی قروہ، سریہ حسمٰی، سریہ ام قرفہ وغیرہ۔ بعض قتل غلط فہمی کی بنا پر ہوئے تھے۔ بعض اسفار دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے تھے۔ ان کی تعداد تینتیس (۳۳) ہے۔ بعض جنگیں معاہدہ

توڑنے کی وجہ سے ہوئیں جیسے بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ، بنومصطلق، سریہ ذوالقصہ، سریہ بنوطے وغیرہ۔ فتح مکہ کو بھی اسی ذیل میں شمار کرنا چاہیے۔

مذکورہ جنگی نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگیں درج ذیل قبائل کے درمیان ہوئی ہیں:

(۱) قریش مکہ (۲) بنوغطفان وانمار (۳) بنوسُلیم (۴) بنوفزارہ وعذرہ (۵) بنوکلاب ومرہ (۶) بنوعضل وقارہ (۷) بنواسد وبنوقضاعہ (۸) بنوذکوان (۹) بنولحیان (۱۰) بنوسعد بن بکر (۱۱) بنوہوازن (۱۲) بنوتمیم (۱۳) بنوثقیف (۱۴) یہود (۱۵) نصاریٰ۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مدینہ کی اسلامی سلطنت کو خطرات تو چاروں طرف سے لاحق تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی جنگی فراست نے بہت سے مواقع کو ٹال دیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ آپؐ نبی رحمت تھے، نبی زحمت نہیں تھے۔ اب ہم ان چند غزوات پر ایک نظر ڈالیں گے، جنھیں واقعی جنگ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔

۱- غزوۂ بدر

اسے بدرالکبریٰ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ ۲ھ میں واقع ہوئی۔ اس کا ذکر سورۂ انفال میں ہے۔ قریش کا ایک ہزار کا لشکر ابوجہل کی سربراہی میں تھا۔ مسلمان تین سو تیرہ کی تعداد میں رسول اللہ ﷺ کے ہم راہ تھے۔ اللہ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت جب دی اس کے بعد یہ پہلی جنگ تھی۔ اجازت کے الفاظ ہی یہ بتلانے کے لیے کافی ہیں کہ مسلمان اس وقت کس قدر دباؤ میں تھے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ (الحج: ۳۹،۴۰)

”جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انھیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔“

اس جنگ میں قریش کے سترّ آدمی مقتول اور اتنے ہی گرفتار ہوئے جنھیں بعد میں مختلف شرائط پر آزاد کر دیا گیا۔ اس جنگ میں ابوجہل اور تمام سرداران قریش کھیت رہے۔ مسلمانوں میں صرف بائیس (۲۲) افراد شہید ہوئے۔

۲-غزوۂ احد

اس جنگ پر تبصرہ سورۂ آل عمران میں ہے۔ ۳ھ میں تین ہزار کی فوج کے ساتھ ابوسفیان کی قیادت میں مکہ کا لشکر حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں کی فوج صرف چھ سو پچاس (۶۵۰) پیادہ افراد پر مشتمل تھی۔ آپؐ نے جبل احد کے قوس میں اپنی فوج کو متعین فرمایا اور عبد اللہ بن جبیرؓ کو پچاس تیراندازوں کے ساتھ جبل عینین (جبل رُماۃ) پر متعین کر دیا تا کہ پشت پر سے کوئی حملہ نہ کر سکے۔ لیکن ابتدائی فتح سے بے قرار ہو کر سوائے سردار کے سبھی لوگ درہ چھوڑ گئے اور اسلامی لشکر کی پشت کو خالد بن ولید کے دستہ کے لیے خالی چھوڑ دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو تمام جنگوں سے زیادہ جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس جنگ میں سترّ مسلمان شہید اور چالیس زخمی ہوئے۔ دشمن صرف تین مقتول ہوئے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی جنگی فراست کی وجہ سے وہ اپنی اس عارضی فتح سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے، کیوں کہ آپؐ نے حمراء الاسد تک لشکر کفار کا تعاقب کر کے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا۔

۳-غزوۂ احزاب یا خندق

یہ جنگ ۵ھ میں ہوئی۔ ابوسفیان کی سپہ سالاری میں دس ہزار کا لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ اس لشکر میں عرب کے تمام قبائل شریک تھے۔ ایک لحاظ سے یہ مدینہ کی سلطنت پر اہالیان کفر کا متفقہ حملہ تھا۔ مسلمانوں کی جنگی مردوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ آں حضورؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے مدینہ کے اطراف خندق کھود کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ بنوقریظہ کی طرف سے غداری کا اندیشہ تھا، سو وہ بجا ثابت ہوا لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایک نومسلم صحابی کے ذریعہ یہود بنوقریظہ اور لشکر مکہ کے درمیان پھوٹ ڈلوادی۔ اس جنگ میں دشمن ناکام واپس ہوا اور اس کے دس آدمی مقتول ہوئے۔ مسلمان شہداء کی تعداد چھ تھی۔

۴-غزوۂ بنو قریظہ

یہ جنگ خندق کے فوراً بعد واقع ہوئی۔ یہودیوں کی غداری کا انتقام لینا ضروری تھا۔ بنو قریظہ نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے حلیف حضرت سعد ابن معاذؓ کو حکم مقرر کیا جنھوں نے فیصلہ کیا کہ یہود کے تمام مردان جنگی قتل کیے جائیں اور بقیہ لوگ اسیر کیے جائیں۔ چناں چہ چار سو آدمی قتل ہوئے۔ یہ پورے دور مدنی میں دشمن کا سب سے بڑا جانی نقصان تھا۔ دو سو قید ہوئے۔ مسلمان شہداء کی تعداد صرف چار تھی۔

۵-غزوۂ حدیبیہ

ہجرت کے چھٹے سال نبیؐ نے خواب دیکھا کہ آپؐ صحابہ کرام کے ساتھ مسجد حرام (کعبہ) میں داخل ہو کے طواف اور عمرہ کیا اور سر کے بال منڈوائے۔ آپؐ نے صحابہ کرام سے یہ خواب بیان کیا اور چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے نکل پڑے، لیکن جاسوسوں نے خبر دی کہ مکہ والے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ آپؐ کراع الغمیم سے راستہ تبدیل کر کے حدیبیہ پہنچ جاتے ہیں جو جدہ اور مکہ کے درمیان ہے۔ یہ مقام آج کل شمیسی کہلاتا ہے اور آپؐ کے احرام کھول دینے کی وجہ سے جدہ کی طرف سے مکہ آنے والوں کی میقات قرار پایا ہے۔ یہاں پر مکہ والوں سے ایک صلح نامہ پر دستخط ہوتے ہیں، اور آپؐ مدینہ تشریف لاتے ہیں۔ مکہ والوں سے صلح کے اسباب پر شمس الائمہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ دفاعی نقطہ نظر سے رسول اللہ ﷺ شمال یا جنوب میں سے ایک سمت کو محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ شمال میں یہودیوں سے صلح ناممکن تھی، اس لیے آپؐ نے ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے جنوب کی سمت کو اس صلح کے ذریعہ محفوظ کر لیا۔ (۱۶۲)

۶-غزوۂ خیبر

محرم ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے چودہ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر نکلے۔ یہودیوں کا سردار کنانہ بن ابوالحقیق دس ہزار مردان جنگی کے ساتھ مقابل ہوا۔ مسلمان اٹھارہ شہید اور پچاس زخمی ہوئے۔ یہودی ترانوے (۹۳) مقتول ہوئے۔ اس جنگ نے یہودیوں کی کمر توڑ دی اور وہ جزیرۃ العرب سے بدر کر دیے گئے۔ اس طرح اسلام ان کے فتنوں سے محفوظ ہو گیا۔

۷-سریہ موتہ

اسلامی سفیر حارث بن عمیر ازدیؓ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے زید بن حارثہؓ کی ماتحتی میں تین ہزار مسلمانوں کی فوج شرحبیل بن عمرو غسانی کے خلاف روانہ کی گئی۔ رومی اس کی مدد کو آئے ہوئے تھے۔ زید بن حارثہؓ، جعفر طیارؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اسلامی لشکر کو بچا کر لے آئے۔ ایک لاکھ دشمن کے مقابلہ میں صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے۔ دشمن کے مقتولین کا صحیح اندازہ نہیں لیکن تخمیناً تین ہزار ہے۔

۸-فتح مکہ

یہ رمضان المبارک ۸ھ کا واقعہ ہے۔ یہ فتح نہیں بلکہ مرحمت نبویؐ کا انتہائی شان دار مظاہرہ تھا۔ جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ۔ آپؐ کی تحفظی تدابیر کی وجہ سے جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ غلط فہمی کی وجہ سے بارہ مشرک قتل اور دو مسلمان شہید ہوئے۔ آپؐ نے عام معافی کا اعلان کیا اور پورا مکہ ایک ہی دن میں مسلمان ہو گیا۔

۹-غزوہ حنین

اسے غزوہ اوطاس یا ہوازن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ فتح مکہ کے بعد متصلاً ہوئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کو پہلی بار اولین فرصت میں شکست ہوئی تھی لیکن بعد میں انھیں غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ دشمن کے اکہتر (۷۱) آدمی مقتول اور چھ ہزار اسیر ہوئے جنھیں بعد میں رہا کر دیا گیا۔ مسلمان شہداء کی تعداد چھ تھی۔

۱۰-غزوہ طائف

بارہ ہزار لشکر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں بنو ثقیف کا محاصرہ کیا لیکن ایک مہینہ کے بعد محاصرہ اٹھا کر واپس چلے آئے۔ فوراً بعد ہی پورا قبیلہ حاضر خدمت ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

ان کے علاوہ سریہ ابن العوجا (ذوالحجہ ۷ھ۔ بنو سلیم کے خلاف) میں انچاس (۴۹) مسلمان اور سریہ ذات اطلح (ربیع الاول ۸ھ۔ بنو قضاعہ کے خلاف) میں چودہ مسلمان شہید ہوئے جو بڑی تعداد ہے۔

اسلامی جنگوں کا موازنہ معاصر اقوام سے

رسول اکرم ﷺ نے مدینہ کے دس سالہ دوران قیام میں انیس (۱۹) جنگوں میں بہ نفس نفیس شرکت کی۔(۱۶۳) باقی سب میں صرف صحابہ کرامؓ نے حصہ لیا۔لیکن اس تحریر کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کیا یہ محدود المقاصد جنگیں اسلام کو تلوار سے پھیلانے کی دلیل بن سکتی ہیں؟ دراصل دنیا میں جو بھی جنگیں لڑی جاتی ہیں ان کا نقطۂ نظر مادی ہوتا ہے جب کہ اسلامی جنگوں کا نقطۂ نظر روحانی اور دعوتی ہوتا ہے۔اسی وجہ سے اسلامی لشکر کو اللہ کی طرف سے معجزانہ امداد بھی ملتی رہی۔ اللہ بھی فرماتا ہے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ:۲۴۹)

"کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بہ حکم الٰہی بڑے گروہوں پر غالب آجایا کرتے ہیں۔"

آج کل جنگ باز قوموں خصوصاً امریکہ اور برطانیہ نے حق دفاع (Right of Defence) کو پوری دنیا تک پھیلا دیا ہے بلکہ امریکہ نے تو خلا میں بھی اپنے دفاع کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں اور بلا کسی ادنیٰ ثبوت کے اپنی جاسوسی رپورٹوں کے بہانے جس ملک پر چاہتا ہے چڑھ دوڑتا ہے۔ان سب کی ترکتازیوں کا اصل ہدف مسلمان ممالک ہیں جنھیں وہ ایک ایک کر کے زیر کرتے چلے جا رہے ہیں تاکہ مسیحیت اور صہیونیت کا غلبہ ہو سکے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی باز دید سے وہ شاد کام ہو سکیں۔ستم یہ کہ وہ اسلام پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں اور اسلامی ممالک کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ قرآن سے جہاد کی آیتوں کے اخراج کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔اسلام جہاد کو خیر العمل قرار دیتا ہے لیکن کشت وخون کو بالکل پسند نہیں کرتا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ:۳۲)

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔"

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:لا تتمنو لقاء العدو واسئلوا اللہ العافية فاذا لقيتم فاصبروا واعلموا ان الجنة تحت ظلال السيوف ۔"دشمن سے مقابلہ کی تمنا

مت کرو بلکہ اللہ سے امن و عافیت کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر جم کر لڑو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' اور: لا تقتلوا اصحاب الصوامع۔ ''خانقاہ نشین زاہدوں کو قتل مت کرو۔'' اور یہ بھی: لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار۔ ''آگ کا عذاب دینا سوائے آگ پیدا کرنے والے کے کسی کو سزاوار نہیں۔'' مزید یہ بھی: عن ابی ایوب الانصاری نھی عن الصبر۔ ''آپؐ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' (۱۶۴)

آج کل کی جنگوں میں پوری کی پوری بستیاں اور شہر جلا کر خاک کر دیے جاتے ہیں۔ یہ بالکل ہی توریت کے احکام پر عمل ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے ہم بائبل کے صرف احکام اور اس پر عمل درآمد سے متعلق چند حوالے نقل کرتے ہیں تا کہ صاحبان تقدیس کے لیے سرمہ چشم عبرت بن سکیں۔ تفصیل کے لیے قارئین اصل بائبل سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

'جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے تو تو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا...ان کے مذبحوں کو ڈھا دینا...وغیرہ، (۱۶۵) عمالیق کو مکمل طور سے نیست و نابود کر دینے کی ہدایت۔ (۱۶۶) آگ لگانے کی ہدایت اور اس پر عمل (۱۶۷)۔ بزق میں دس ہزار مردوں کا قتل (۱۶۸)۔ موآب میں دس ہزار مردوں کا قتل (۱۶۹)۔ یبیس یلعاد کے تمام باشندوں کو عورتوں اور بچوں سمیت قتل کرنے کا حکم (۱۷۰)۔ داؤد کے ہاتھوں فلستیوں کا قتل۔ ان کو رسی سے ناپ کر قتل کر دینا یا چھوڑ دینا۔ (۱۷۱) داؤد کا آرامیوں کے سات سو (۷۰۰) رتھوں کے آدمی اور چالیس ہزار سواروں کو قتل کرنا (۱۷۲)۔ بنی اسرائیل نے ایک دن میں آرامیوں کے ایک ہزار پیادے قتل کر دیے۔ (۱۷۳) خدا کے فرشتے نے اسور کی لشکر گاہ میں ایک لاکھ پچاسی ہزار آدمی مار ڈالے۔ (۱۷۴)

اس ہوشربا تعداد کا مقابلہ مدینہ کی اسلامی سلطنت میں مقتولین کفار کی تعداد سے کیجیے اور صہیونیوں اور صہیونی مسیحیوں کی دیدہ دلیری کی داد دیجیے۔ یاد کر لیجیے کہ ہجرت سے لے کر آں حضور ﷺ کی وفات تک دشمنوں کے مقتولین کی تعداد صرف سات سو پچپن (۷۵۵) ہے۔ (۱۷۵) آپؐ کا یہ ارشاد گرامی سامنے رہے: نھی النبی ﷺ عن قتل النساء والصبیان۔ ''نبیؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔'' اور یہ حکم بھی: لا تقتلوا شیخاً فانیاً ولا طفلاً صغیراً ولا امرءۃً ولا تغلوا و ضموا غنائمکم واصلحوا و احسنوا ان

اللّٰہ یحب المحسنین۔ ''نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو نہ چھوٹے بچے کو نہ عورت کو۔ اموال غنیمت میں چوری نہ کرو۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو۔ نیکی و احسان کرو کیوں کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے''۔ (۱۷۶) واضح رہے کہ بعد کے ادوار میں فقہائے اسلام نے دارالاسلام کے مقبوضہ علاقوں کے حصول کے لیے جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔ لیکن اس تفریض کی شرائط بھی مقرر کردی ہیں۔ یہ تمام چیزیں قرآن وسنت ہی سے ماخوذ ہیں۔

اس درازنفسی کا حاصل یہ ہے:

(۱) رسول اللہ ﷺ کی ساری جنگیں دفاعی تھیں۔

(۲) آپؐ کا مقصد قتل وخون ریزی نہیں بلکہ رافت ورحمت تھا۔

(۳) کم سے کم جانی نقصان کی کوشش کی گئی کیوں کہ آپؐ کو علم تھا کہ یہ قوم مسلمان ہونے اور سر بلند ہونے والی ہے۔

(۴) آپؐ نے جنگ وصلح کے قواعد مقرر فرمائے اور ان پر عمل فرمایا۔

(۵) رائج الوقت معمولات کے علاوہ توریت کے ظالمانہ قوانین جنگ کی اصلاح فرمائی۔

(۶) تہذیبی، سیاسی یا مالی کسی بھی قسم کے استحصال اور استعمار کے لیے اسلام نے جنگ کو جائز نہیں رکھا جیسا کہ آج کے جنگ بازوں کا وطیرہ ہے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر دس سال میں مدینہ کی اسلامی حکومت کا رقبہ تین مربع کیلومیٹر سے بڑھ کر تیس لاکھ مربع کیلومیٹر ہوگیا۔ (۱۷۷) اور دنیا میں اس مرکز سے تعلق رکھنے والوں کی اصل تعداد کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے الحمدللہ زیادہ ہے۔

جہاد اور عالمی صورت حال
مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ

جہاد کے موضوع پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل ایک علمی گفتگو ہے۔ عملی طور سے امت مسلمہ اس وقت جن حالات کا شکار ہے اس کا ایک مختصر نقشہ درج ذیل ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں الگ الگ حالات کا شکار ہیں۔ ان لوگوں کے مقتضیات بھی الگ ہیں۔ اس لیے ان کے حالات پر الگ الگ غور کرنے اور ذمے داری متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

(ا) اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ ضرورت کا حقیر ترین حصہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات بار بار یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ اسرائیل فلسطین میں ایک ناجائز وجود کی حیثیت رکھتا ہے جسے اقوام متحدہ کے ذریعے ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء کو قرارداد نمبر 181 C11 کے ذریعہ وجود بخشا گیا تھا، اور فلسطین کی ۵۷ فیصد زمین اسے تحفہ میں دے دی گئی تھی جب کہ وہاں کے اصل باشندوں کو صرف ۴۳ فیصد کا حق دار گردانا گیا تھا۔ اسرائیل نے اپنے یوم وجود یعنی ۱۴ رمئی ۱۹۴۸ء ہی کو فلسطین کے ۷۰ رفیصد حصہ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت تشکیل دی تھی اور اب وہ بہ شمول مشرقی یروشلم جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے پورے فلسطین پر قابض ہے۔ اس نے اب تک اپنے خلاف اقوام متحدہ کی ۶۵ قراردادوں کو پیروں تلے روندا ہے۔ سلامتی کونسل کی تاریخ میں نصف سے زیادہ مرتبہ حق امتناع (Vetoes) امریکہ نے اسرائیل کی حمایت میں استعمال کیا ہے اور انسانی حقوق کا

نام نہاد محافظ اور پاسباں ادارہ کچھ بھی نہیں کر سکا، جب کہ اسی ادارہ کی قراردادوں پر افغانستان اور پہلی بار عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی اور دوسری بار امریکہ نے اسی اقوام متحدہ کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے پورے عراق کو ریگستان میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ادارہ خود امریکہ کی چاکری کر رہا ہے۔ اسرائیل میں شہری کوئی نہیں ہوتا کیوں کہ وہاں ہر بالغ شخص پر گوریلا ٹریننگ لازمی ہے۔ اپنے اس فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے چند سال پہلے کشمیر میں ایک حملہ میں دو اسرائیلی سیاحوں نے خود مجاہدین ہی کو قتل کر دیا تھا۔ امریکہ کی فوج کا ہر سپاہی ایک سیاسی معاہدہ کے تحت ہر وقت اسرائیل کی حمایت میں لڑنے کا پابند ہے، اس کا مشاہدہ مصر کی رمضان کی جنگ میں ہم کر چکے ہیں کہ کس طرح مصر جیتی ہوئی بازی ہار گیا تھا۔ اس کے بعد سینا کا علاقہ خالی کرانے کے لیے انوار السادات کو مجبوراً کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کرنا پڑا تھا۔ ان حالات میں حماس یا فلسطینیوں کی تمام مجاہدانہ کارروائیاں خواہ وہ نام نہاد اسرائیل کے خلاف ہوں یا امریکی فوجیوں کے خلاف ان کے حق دفاع میں شامل ہیں اور جہاد کے عنوان میں اسے نمایاں مقام حاصل ہونا چاہیے۔ بہت سے علماء نے جن میں علامہ یوسف القرضاوی بھی شامل ہیں فلسطینیوں کی خودکش کارروائیوں کو بھی جو قابض دشمنوں کے خلاف ہوں جائز قرار دیا ہے۔

(۲) شیشان یا چیچنیا کی آزادی کو جس طرح سلب کیا گیا وہ تاریخ عالم کا ایک دردناک باب ہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹ کر بکھر جانے کے بعد مشرقی یورپ کی تمام عیسائی ریاستوں نے نہ صرف کمیونزم کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا بلکہ خود کو عیسائی دنیا سے وابستہ کر لیا۔ لیکن جب وسط ایشیا اور قفقاز کی مسلم ریاستوں نے یہ حق استعمال کرنا چاہا تو انھیں بہ جبر روک دیا گیا۔ یورپ اور امریکہ کی مسیحی طاقتیں جو ابھی تک سوویت یونین کو توڑنے کے لیے مسلم تنظیموں اور اسلامی تحریکوں کی اخلاقی اور مادی امداد کر رہی تھیں، اب اس تعاون سے دستکش ہوگئیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس پوری پٹی کو اپنے زیر اقتدار رکھنے کے لیے روس کی تائید وحمایت پر کمر بستہ ہوگئیں تاکہ ان ریاستوں میں اسلامی حکومت قائم نہ ہو سکے۔ چناں چہ روسی ترکستان کی ساتوں مسلم ریاستوں میں پہلے مقامی کمیونسٹوں کو ریاستوں کا سربراہ بنایا گیا پھر تحفظ کے نام پر روسی فوجیں اتار دی گئیں۔ قفقاز کی ایک چھوٹی سی ریاست چیچنیا کے عوام نے جن کو زار روس کے زمانے میں ملک بدر کر دیا گیا تھا اپنے وطن لوٹنے کے بعد ملک کی آزادی کا اعلان کر دیا، لیکن روس نے اسے

تسلیم نہیں کیا اور جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت امریکہ ان مجاہدین کی حمایت میں تھا لیکن مسلم ممالک پر دباؤ رکھنے کی پالیسی کے تحت اس نے بعد میں روس کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی اور پوتن (Putin) نے صدر بننے کے بعد دوبارہ چیچنیا کے دارالحکومت گروزنی پر قبضہ کر کے ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی۔ اس کے خلاف وہاں کے عوام کئی سال سے صف آرا ہیں۔

(۳) فلپائن کا جنوبی علاقہ منڈاناؤ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں پر یورپ اور امریکہ کی عیسائی حکومتوں کی شہ پر حکومت نے اپنے ہی ملک کے عوام کے خلاف فوج کشی کی ہے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ انڈونیشیا کے ایک چھوٹے سے جزیرہ تیمور (Timor) کے مشرقی حصہ پر عیسائی اکثریت ہونے کی وجہ سے قتل عام کا الزام لگا کر اقوام متحدہ نے ایک عیسائی (کیتھولک) حکومت بنادی۔ اس وقت کے جنرل سکریٹری کوفی عنان کو جو اتفاق سے خود بھی کیتھولک ہیں، جنوبی فلپائن نہیں نظر آیا تھا جہاں کے مسلمان گزشتہ تیس سالوں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

(۴) جس طرح اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں روس نے روسی ترکستان پر قبضہ کیا ویسے ہی چین نے چینی ترکستان (جس کا صدر مقام پہلے کاشغر تھا اور اب ارپچی ہے) پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ علاقہ سنکیانگ (اب زین جیانگ) کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

لیکن چین نے یہاں کی تہذیبی شناخت ختم کر دی ہے۔ اگر یہاں کے مسلمان اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

(۵) شمالی میانمار (اراکان برما) میں وہاں کی بودھ فوجی حکومت نے مسلمانوں کو مکمل طور سے مٹا ڈالنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے، جس کے خلاف مسلمانوں کو اپنی جانی، مالی، مذہبی اور تہذیبی بقا کی جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ اسلام یوں تو برما میں بہت پہلے سے موجود تھا لیکن تاریخ داں اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ اورنگ زیب سے شکست کھانے کے بعد اس کے بھائی شاہ شجاع نے شمال مشرقی ہندستان اور اراکان برما میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی جس کا صدر مقام مانڈلے تھا۔ آسام اور اراکان میں مسلمانوں کی اکثریت کا سبب بھی یہی ہے۔

(۶) افغانستان اور عراق پر امریکہ کا ناجائز قبضہ اور اس کی پٹھو حکومتیں قائم ہیں اور اس

نے بانگ دہل اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ان ممالک میں مذہبی حکومت قائم نہیں ہونے دے گا۔ یہ اعلان خود اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی ہے۔

(۷) کوسووا اور دارفور کا مسئلہ صہیونی طاقتوں نے الجھا رکھا ہے۔

(۸) ترکی، مصر اور الجزائر، مسلم اکثریتی ممالک ہیں۔ یہاں کی جمہوری آواز کو مقامی حکمرانوں کے ذریعے یا امریکہ کے اشارے پر ملٹری گھن گرج سے زیر کر لیا گیا ہے۔ ان ممالک میں اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کو طرح طرح کی آزمائشوں اور عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے کام کرنے کی سبیل کیسے پیدا ہو؟ یہی حال روسی ترکستان کی مسلم ریاستوں کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاد کے وہ احکام یہاں منطبق نہ ہوں گے جو دوسری جگہوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ لیکن لوگوں کو یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ یہاں کی اسلامی تحریکات کے خلاف حکومت کی سازشوں اور ان کے توڑ کے لیے مجاہدین کی کوششوں کی حدود کیا ہیں اور انھیں کیا نام دیا جائے گا؟

(۹) رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ جزیرۃ العرب کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے خالی کرا لیا جائے (یہ احادیث مختلف الفاظ میں بخاری: کتاب الجزیہ، کتاب الاکراہ، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ؛ مسلم: کتاب الجہاد؛ ترمذی: کتاب السیر؛ ابو داؤد: کتاب الخراج والامارۃ والفیئ؛ دارمی: کتاب السیر؛ مؤطا امام مالک: کتاب الدعاء للمدینۃ واھلھا؛ نیز مسند احمد؛ مسند طیالسی اور سیرت ابن ہشام میں موجود ہیں)۔ حضرت عمرؓ نے اسی لیے اپنے عہد میں پورے جزیرۃ العرب کو ان لوگوں سے خالی کرا لیا تھا۔

سب لوگوں کو معلوم ہے کہ کویت پر عراق کا حملہ امریکہ کی شہ پر ہوا تھا۔ پھر عربوں کی مدد کے بہانے امریکہ نے سعودی عرب کو اپنا Base بنایا اور کویت میں بھی اپنا فوجی اڈہ قائم کیا۔ اس کے بعد قطر میں اس کا فوجی مرکز قائم ہوا۔ یمن میں اس کا بحری اڈہ پہلے سے موجود تھا۔ یہ تمام علاقے جزیرۃ العرب میں واقع ہیں۔ اسامہ بن لادن کی دیگر سرگرمیاں خواہ کتنی ہی قابل اعتراض کیوں نہ ٹھیریں لیکن اس کی تحریک کی ابتدا تو اسی مطالبہ سے ہوئی تھی کہ یہ فوجی اڈے ہٹائے جائیں۔ اسلامی شریعت کی رو سے یہ بات بالکل درست تھی۔ موجودہ نام نہاد دہشت گردی کی ابتدا اسی ناانصافی کو ختم کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔ یہ بالغ نظر علماء کا کام ہے کہ حکومتوں کے

معاہدات اور رسول اللہ ﷺ کے تاکیدی حکم کے مابین ایک خط فاصل کھینچیں تاکہ اس فیصلہ کے تعارض یا توافق اور دہشت گردی اور غیر ملکی استیلاء کے خلاف جدو جہد کے بارے میں شرعی حکم سامنے آسکے۔

(۱۰) اسلامی عقیدۂ جہاد پر گفتگو کرتے ہوئے اس احساس سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہے کہ یہ ساری کم زوری اسلامی خلافت قائم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر دنیا کے تمام اسلامی مما لک ایک جھنڈے تلے اکٹھا ہوتے تو اسلام کو یہ برے دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ لیکن یہ موقعہ اس نکتہ پر غور کرنے کے لیے بہت موزوں ہے کہ کیا اقوام متحدہ جس کے سارے کام اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہورہے ہیں اس لائق ہے کہ مسلمان مما لک اس کی ممبری قبول کریں، اور اپنی قومی، تہذیبی، ملّی اور مذہبی انفرادیت کو حقیر ذاتی فوائد کے لیے گروی رکھ دیں؟ پانچ طاقتوں کے حق استر داد (Veto Power) کے بعد اس کی ممبر شپ کی کیا معقولیت ہے؟ کیا دنیا کے ستر مما لک اپنی الگ فعال تنظیم نہیں بنا سکتے ؟

ضرورت ہے کہ بالغ نظر مسلم علماء سر جوڑ کر بیٹھیں اور جہاد کے خلاف غیر معقول پروپیگنڈہ اور دہشت گردی کے الزام کے خلاف مسلم مما لک کو اجتماعی اور پر زور تحریک چلانے کا حوصلہ دیں تاکہ صحیح صورت حال سامنے آسکے اور مسلم امت کا احساس جرم ختم کیا جا سکے۔

گزشتہ ابواب کا خلاصہ

انسانوں کی ہدایت کا کام اللہ تعالیٰ نے روز اول ہی سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر زمانے میں انبیاء و رسل مبعوث فرمائے، جن کا کام پیغام الٰہی کی ترسیل اور تفہیم و تشریح کے علاوہ عملی طور سے اللہ کی ہدایات کے تحت اس دین کی تنفیذ بھی رہا ہے۔ آخری نبی اور رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اللہ نے اپنے دین کو مکمل فرما دیا اس لیے اب مزید کوئی نبی بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آپؐ کے بعد اللہ نے یہ کام امت مسلمہ کے سپرد فرما دیا اور رسول اللہ ﷺ کو ان کے لیے نمونہ بنا دیا۔ آپؐ کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو نمونہ بناتے ہوئے یہ اشارہ بھی دیا کہ دعوت دین کے معاملے میں وہی طریق کار اختیار کیا جائے، جو تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا تھا۔

انبیائے کرام پر اللہ کی رحمت خاص ہوا کرتی تھی اور وہ قوت ایمانی کے علاوہ تمام انسانی اخلاق حسنہ کے جامع ہوا کرتے تھے۔ دعوت دین چوں کہ انبیاء علیہم السلام کا مشن رہا ہے اس لیے اب اس دین کے داعیوں کو ان صفات سے متصف ہونا پڑے گا جن صفات سے انبیاء اور خصوصیت سے حضرت محمد ﷺ جامع تھے۔ اس کے بغیر داعیان دین کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں۔

ان صفات میں سب سے پہلی صفت ایمان ویقین کی ہے۔ ایمان ویقین کا تعلق داخلی طور سے انسان کے قلب اور خارجی طور سے امور غیبیہ سے ہے۔ ایمان اور یقین تین باتوں پر مشتمل ہے: ایک، اللہ کی وحدانیت، دوسرے، انبیاء علیہم السلام کی رسالت اور تیسرے آخرت یعنی روز جزا۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ غیب کی بہت سی نشانیاں چشم سر سے دکھلا دیتا تھا لیکن دوسرے لوگوں کا غیب پر ایمان رسول کی شہادت کی بنا پر ہوا کرتا ہے۔

دعوت دین کے لیے دوسری انبیائی صفت حسن اخلاق ہے۔ دعوت کا کام وہ لوگ انجام دے ہی نہیں سکتے، جو حسن اخلاق سے عاری ہوں۔ اس لیے داعیوں کو ان تمام صفات حسنہ سے متصف ہونا چاہیے جن سے تمام انبیائے کرام بہ تمام وکمال متصف تھے۔ جیسے حسن سلوک، صبر و استقامت، حلم وعفو، ایثار وقربانی، عدل وقسط، جرأت وشہامت، حسن بیان وطلاقت لسانی اور کمال شخصیت وصلاحیت وغیرہ۔ انبیائے کرام کے اندر یہ تمام صفات پائی جاتی تھیں، لیکن رسول اللہ ﷺ تو جامع الصفات تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپؐ اپنے صحابۂ کرام میں یہ صفات پیدا کرنے کی کوشش فرماتے رہتے تھے۔ چناں چہ صحابۂ کرام کے اندر ان تمام صفات کا پرتو نظر آتا ہے۔

دعوت دین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ داعی مخاطب کے سامنے اپنی باتوں کو حکمت کے ساتھ اچھے الفاظ اور اچھے انداز میں پیش کرے، جس سے مخاطب یہ محسوس کرے کہ داعی کے دل میں اس کے لیے خلوص اور خیر خواہی کی تڑپ ہے۔ اگر کبھی بحث ومباحثہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کا انداز ایسا ہو کہ مخاطب کی دل آزاری نہ ہو بلکہ مناسب طریقے سے ان کے دلائل کا جواب دیا جائے، پھر اپنے دلائل کی برتری ثابت کی جائے۔ داعی کو مخاطب کے مزاج، اس کی طبیعت، اس کی فکر اور اس کے معیار علم وفہم کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ دعوت کے مخاطبین الگ الگ شعبہ ہائے زندگی سے متعلق ہوسکتے ہیں۔ ان سے گفتگو کرنے کے لیے انھی کے معیار کے داعی ہونے چاہئیں۔

دین کی دعوت میں تدریج اور ترتیب کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ پورا دین ایک ساتھ نہیں نازل ہوا تھا۔ بلکہ اثر پذیری اور اقتضائے وقت کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تھا۔ اس لیے جہاں جس قسم کا موقع یا ماحول ہو، اس کے لحاظ سے پیش قدمی کرنی چاہیے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ تدریج جزء سے کل کی طرف ہونی چاہیے کیوں کہ اب دین مکمل ہو چکا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔

داعی کو اپنے کام سے کبھی اکتاہٹ نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ مسلسل پانی پڑنے سے پتھر بھی گھس جاتا ہے۔ مخاطب کو اگر بار بار مختلف انداز میں سمجھایا جائے تو اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دین کی دعوت میں تسلسل اور استمرار مطلوب ہے۔ اس محنت کے نتیجے میں داعی کو اگر افراد ملتے جائیں تو ان کی تربیت بھی کرتے رہنا چاہیے تا کہ وہ بھی دعوت کے کام کے لیے تیار ہوسکیں۔ اس انتخاب میں لیاقت اور صلاحیت کو ملحوظ رکھنا مفید مقصد ہوگا۔

انبیائے کرام کے طریق کار میں ہجرت اور جہاد بھی شامل رہے ہیں۔ اگرچہ موجودہ حالات کے تناظر میں ان کی حیثیت تاریخی اور علمی بن کر رہ گئی ہے، لیکن واضح رہے کہ دین کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوتا۔ اگر مستقبل کے حالات کبھی متقاضی ہوں تو ہجرت اور جہاد پر بھی عمل کرنا لازم ہوگا۔ ہجرت اپنے دین اور عقیدہ کی حفاظت کے لیے ناموافق حالات سے مساعد حالات کی طرف کوچ کر جانے کا نام ہے۔ دنیا کے موجودہ نظام پر صہیونی گرفت نے جہاں یہودیت، مسیحیت اور شرک کو ہر طرف پنپنے کے مواقع فراہم کیے ہیں وہیں اسلام کی طرف پیش قدمی کی تمام راہیں مسدود ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس صورت حال سے ہجرت اور جہاد کے احکام پر بھی اثر پڑا ہے۔ فقہائے کرام نے جہاد کے جواز یا وجوب کے لیے جو شرائط عائد کی ہیں اگر انھیں سامنے رکھا جائے تو اب یہ فریضہ تقریباً قیامت تک کے لیے ساقط ہو چکا ہے۔ مسلمان بہت سے ممالک میں اپنے عقیدہ وعمل کے لیے حالت جنگ میں ہیں۔ اور جن اکثریتی مسلم ممالک میں قیام نظام اسلامی اور نفاذ قوانین اسلامی کی تحریکیں چل رہی ہیں وہاں حق اور باطل کی کش مکش کھلم کھلا محاذ آرائی تک پہنچ چکی ہے۔ اس صورت حال میں جہاد کی شروط وقیود پر سابق علماء کے اجتہادات کافی نہیں ہیں۔ حالات کے فرق اور تدریج کی مناسبت سے فلسطین، چیچنیا، زین جیانگ، میانمار، فلپائن، تھائی لینڈ، روسی ترکستان کی آزاد مسلم ریاستیں، قفقاز اور ماورائے قفقاز، پھر افغانستان، عراق، الجیریا، ترکی، شام، غرض کہ ان تمام ہی ممالک کے حالات دعوت اسلامی کے کام اور نفاذ دین کے معاملے میں اجتہاد عمل کے متقاضی ہیں۔

جب رب کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے دین قائم کرنے کی بات آتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کیا ہے؟ قرآن اس سوال کا واضح اور دوٹوک جواب دیتا ہے۔ اس کے نزدیک اعتقادات یعنی توحید، رسالت، آخرت اور اس کی جزئیات، تفصیلات اور مقتضیات پر ایمان لانا دین ہے۔ عبادات دین ہیں کیوں کہ یہ اللہ کا ذاتی حق ہیں۔ اللہ نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتایا اور اس کے رسولؐ نے اس پر عمل کرنے کا جو سلیقہ سکھایا ہے وہ پورے کا پورا دین ہے۔ حلال وحرام کا پورا قانون جو قرآن میں موجود ہے اور جس کی وضاحت اس کے رسول ﷺ نے فرمائی ہے وہ بھی دین ہے۔ معاشرتی اور عائلی زندگی کے قوانین، دین میں شامل ہیں اور حدود و

تعزیرات تو دین کی روح ہیں۔ قرآن حکیم کی رو سے کسی بھی اسلامی حکومت کا سارا کاروبار اسلامی قانون ہی کی روشنی میں چلنا چاہیے۔ اسلامی مملکت میں اسلامی قانون ہی نافذ ہونا چاہیے۔ اگر اس قانون کی راہ میں باطل قوتیں مزاحم ہوں تو ان سے جہاد کرنا بھی دین ہے۔

انبیائے کرام اسی دین کے قیام کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ لیکن تمام ہی انبیاءؑ نے اپنے کام کی ابتدا شرک کی نفی اور توحید کی دعوت سے کی ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی مخصوص اخلاقی مرض تھا تو اسے بھی اولین دعوت توحید کے ساتھ شامل کرلیا گیا ہے۔ عقیدہ کی اصلاح کے متوازی عبادات کا نظام ہے جو جسمانی بھی ہے اور مالی بھی، جیسے نماز اور روزہ جسمانی عبادات ہیں، زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اور حج مالی اور جسمانی دونوں عبادات کو شامل ہے۔ جہاں تک جہاد فی سبیل اللہ کا تعلق ہے، یہ جان و مال دونوں کو اللہ کی راہ میں قربان کردینے کا نام ہے۔

عبادات کے ساتھ ہی ساتھ فضائل اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے اور مخاطب کے حالات کی مناسبت یا اقتضائے وقت کی رعایت سے آہستہ آہستہ تمام احکام پر عمل پیرا ہونا مطلوب ہوتا ہے۔ دین کے احکام میں تدریج ہے اور نفاذ احکام میں بھی تدریج رہی ہے۔ لیکن اب اسلام مکمل ہو چکا ہے اس لیے داعی مخاطب کو پورا دین پہنچانے کا مکلّف ہے۔ یہ حکمت دین کا تقاضا ہے کہ حالات کی رعایت سے وہ جس تدریج کو مناسب سمجھے اس پر عمل کرے۔ علوم وفنون کے پھیلاؤ اور شاخ در شاخ اس کے تنوع نے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے داعیوں کی راہ عملاً آسان کردی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ تدریج، دین کے پیش کرنے میں ہے، دین کے قبول کرنے میں نہیں ہے۔ دین حق قبول کرنے والوں کے لیے شرط ہے کہ انھیں پورا دین قبول کرنا ہوگا۔ قرآن بہ تدریج تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں نازل ہوا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ پورے دین کو نافذ کرکے اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔

وفات سے پہلے رسول اللہ ﷺ شہادت حق کا فریضہ اپنی امت کے سپرد کر گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی مختلف عنوانات کے تحت امت مسلمہ کو اس کا پابند کیا ہے۔ اس کا پہلا جز اللہ کا حق ہے یعنی عبادت۔ دوسرا جز بندوں میں نیکیوں کو پھیلانا اور لوگوں کو برائیوں سے روکنا ہے، جسے اللہ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام دیا ہے۔ دراصل یہی وہ فریضہ ہے جس کے لیے اس نے

اس امت کو چن لیا ہے۔ امت مسلمہ کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ تمام بندگان خدا تک دین کو پہنچائے اور یہی شہادت حق ہے۔ دین کو قائم کرنے کا ایک جزو یہ بھی ہے کہ اس روئے زمین پر اللہ ہی کا قانون جاری ہو اور اسی قانون کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تمام فیصلے کیے جائیں۔ جو شخص اس پر عمل نہ کرے وہ اللہ کے نزدیک فاسق ہے، ظالم ہے اور کافر ہے۔ اللہ کا قانون وہی ہے جو اس نے قرآن میں نہایت تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ انبیائے سابقین بھی قوانین الٰہی کو نافذ کرنے کے پابند تھے۔ موجودہ توریت میں بھی ان احکام کی بہت سی تفصیلات موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سے احکام کو قرآن نے باقی بھی رکھا ہے اور بعض میں سہولتیں اور رخصتیں عطا فرمائی ہیں۔ توریت کے وہ قوانین جن کو ربیوں نے تبدیل کر دیا تھا، قرآن نے ان کو واضح کر دیا ہے، اور جو اضافے کر دیے تھے ان کو محو کر دیا ہے۔ غرض کہ دین کی تکمیل کے لیے اب قیامت تک دنیا کو جس قانون کی ضرورت ہے وہ اللہ نے قرآن میں مہیا فرما دیا ہے۔ واضح رہے کہ بنی اسرائیل کو امامت سے معزول کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے دین کو بدل ڈالا تھا۔ افسوس کہ آج دنیا کے کسی بھی ملک میں اللہ کا قانون بہ تمام وکمال رائج نہیں ہے۔

اللہ نے انسان کو بزرگی عطا فرمائی ہے اور اس کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے کاروبار دنیا کو اللہ کے قانون کے مطابق ڈھالنے کا مکلّف اور اس کا پابند ہے۔ اگر بندہ اس پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کاربند ہو جائے تو اللہ اسے آخرت میں تو نوازے گا ہی اس دنیا میں بھی اسے اقتدار عطا فرمائے گا، تاکہ تمام روئے زمین اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں سے معمور ہو جائے اور لوگوں کے لیے یہ دنیا جنت ارضی کا نمونہ بن جائے۔ بہ الفاظ دیگر دین اسلام کا داخل ''اقامت دین'' اور خارج ''خلافت الٰہیہ'' ہے۔

تعلیقات وحواشی

(۱) بائبل میں مذکور انبیاء کو ہم پانچ طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا طبقہ ان نبیوں کا ہے جن کا ذکر کتاب پیدائش میں ہے۔ ان کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے اور انتہا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے حضرت شیث علیہ السلام (بائبل میں سیت)، حضرت ادریس علیہ السلام (بائبل میں اخنوخ یا حنوک Enoch) جن کا ذکر قرآن کی سورۂ مریم کی آیت ۵۶ اور سورۂ انبیاء کی آیت ۸۵ میں آیا ہے کا تذکرہ ہے۔ پھر اولاد نوحؑ میں سام کی نویں پشت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام آتا ہے (پیدائش ۱۱: ۱۰ تا ۲۶)۔ ان کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے خاتم النبین حضرت محمد ﷺ ہیں (پیدایش ۱۶: ۱۲-۱۷: ۶، ۷)۔ دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں میں سے ایک یہودا کے نام پر بنی اسرائیل یہودی کہلاتے ہیں۔ ایک دوسرے بیٹے لاوی کی نسل سے حضرات موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا نمبر آپ کے بیٹوں میں گیارہواں ہے۔

دوسرے طبقے میں حضرات موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور حضرات یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ ہیں، جن کے ذکر پر توریت کی پانچویں کتاب (استثنا) کا اختتام ہوتا ہے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جن کا ذکر سفر قضاۃ (Judges) میں آیا ہے۔ اس وقت تک نبوت اور عدالت الگ نہیں ہوئی تھی۔ چوتھا طبقہ وہ ہے جن کا ذکر بعد کے چند صحیفوں یعنی دونوں سموئیل، دونوں سلاطین اور دونوں تواریخ میں ہے۔ پانچویں طبقہ میں بابل کے زمانۂ اسیری اور بعد کے وہ انبیاء ہیں جن کے نام سے کچھ اسفار موسوم ہیں۔ اس طبقے کے انبیاء کا اختتام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر ہوتا ہے۔ عیسائی حضرات سیدنا مسیح علیہ السلام کے بعد بھی رسولوں کے قائل ہیں خصوصیت کے ساتھ پولس (St. Paul) کے، جس نے اصل دین کو مسخ کر کے اس میں ابنیت مسیح، تثلیث اور کفارہ کا عقیدہ شامل کیا۔ عیسائیوں کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کا موجودہ دین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیش کیا ہوا دین نہیں ہے بلکہ سینٹ پال کا تصنیف کیا ہوا دین ہے۔

واضح رہے کہ بائبل میں بہت سے انبیاء کی نبوت کے بارے میں وضوح نہیں ہے جیسے، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام۔ بعض انبیاء کو اس میں صرف بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور بعض کو یہ کتاب صرف کاہن بتلاتی ہے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام۔ قرآن کریم میں کئی قصے ایسے ہیں جن کی اصل بائبل میں ملتی ہے جیسے اصحاب القریہ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ۲۴۸/۴)۔ اس مقالہ میں بائبل کے حوالے تقابل کے لیے ہیں۔ اس سے نبوت اور رسالت کے اسلامی اور یہودی وعیسائی تصور کے فرق کا بھی پتہ چلے گا۔ (۲) فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ : بخاری: المناقب، مسلم: الفضائل، ترمذی: الادب۔ المناقب، نیز مسند امام احمد (۳) ترمذی من حدیث عبداللہ بن مسعودؓ، ج ۲، ص ۱۰۹ (۴) قال فی حجۃ الوداع۔ بخاری من حدیث ابی بکرہ (ج ۲، ص ۲۴)، ابن ہشام (اردو) ۷۴۴/۲، رحمۃ للعالمین (اعتقاد) ۲۳۴/۱، البدایہ والنہایہ (بیروت ۱۴۱۵ھ) ۱۴۹/۵ (۵) البقرہ: ۲۵۹ (۶) بخاری: التفسیر، ترمذی: المناقب، نیز مسند احمد، ابن ہشام ص ۱۵۱، ابن ہشام (اردو) ۲۶۰/۱، الرحیق المختوم (علی گڑھ) ص ۱۰۲، رحمۃ للعالمین ۴۷/۱ (۷) دارمی بواسطہ جبریلؑ المقدمہ: ۷، نزل جبریل ففرج صدرہٗ ثم غسلہٗ بماء زمزم : بخاری: الصلوٰۃ، مسلم: الصلوٰۃ، ترمذی: تفسیر القرآن، نسائی: الصلوٰۃ، نیز مسند احمد... بہ واسطہ ملکین طبقات ابن سعد ج ۱، الرحیق المختوم ص ۸۷ بحوالہ مسلم باب الاسراء ۹۲/۱، رحمۃ للعالمین ۷۱/۱ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ، ابن ہشام (اردو) ۱۸۵/۱، البدایہ والنہایہ ۲۱۹/۲ (۸) اسراء، بیت الحرام سے بیت المقدس کے شبینہ سفر کو کہتے ہیں جو ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے پیش آیا (بنی اسرائیل: ۱)، اور معراج، ملاء اعلیٰ کی سیر اور جنت و دوزخ کی تمثیلی رویت کو کہتے ہیں جس کا ذکر سورۃ النجم کی ابتدائی ۱۸ آیتوں میں ہے (۹) معراج کی طرف اشارہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ میں بھی ہے: ''اور یہ جو کچھ ابھی ہم نے تمھیں دکھایا ہے اس کو اور اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے ہم نے ان لوگوں کے لیے فتنہ بنا کر رکھ دیا۔ ہم انھیں تنبیہ پر تنبیہ کیے جا رہے ہیں مگر ہر تنبیہ ان کی سرکشی میں اضافہ کیے جاتی ہے۔'' امام شوکانی فتح القدیر میں لکھتے ہیں: ھذہ الرؤیا ھی رؤیا عین و ھی الاسرآء و ھی المذکورۃ فی صدر السورۃ و سماھا رؤیا لانھا وقعت باللیل و کانت الفتنۃ ارتداد قوم کانوا اسلموا حین اخبرھم النبی ﷺ انہ اسریٰ بہٖ و قیل کانت رؤیا نوم و قیل ان اللّٰہ سبحانہٗ اراہ فی المنام مصارع قریش فی بدر۔ (نفحۃ العبیر من زبدۃ التفسیر۔ دار السلام ص ۶۸۸، ۶۸۹)، البدایہ والنہایہ ۸۷/۳ تا ۹۵، ابن ہشام (اردو) ۴۳۸/۱ تا ۴۵۴، رحمۃ للعالمین ۷۰/۱ تا ۷۳، الرحیق المختوم ص ۲۱۹ تا ۲۲۷ (۱۰) تلخیص تفہیم القرآن ص ۴۵۱ (۱۱) طبقات ابن سعد ج ۱ (۱۲) بخاری: الانبیاء۔ اللباس، طبقات ابن سعد ج ۱، نیز مسند امام احمد، ابن ہشام ۲۶۶ و ۲۷۰ (۱۳) بائبل میں آپ کی کل عمر ۹۵۰ سال لکھی ہے اور اس کے بیان کے مطابق طوفان اس وقت آیا تھا جب کہ آپؑ کی عمر ۶۰۰ سال تھی۔ لیکن قرآن

نے آپ کی مدت دعوت ۹۵۰ سال بتلائی ہے۔ اس لیے مدت کے معاملے میں بائبل کا بیان نا قابل قبول ہے۔ مولانا مودودیؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے، دیکھیے تفہیم القرآن ۳/۶۸۵ (۱۴) البدایہ والنہایہ ۱/۲۰۱، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بہ روایت انسؓ یہ مدت تیرہ سال، بہ روایت وہب بن منبہ تین سال اور بہ روایت حسن سات سال نقل کی ہے (قصص القرآن، ندوۃ المصنفین ۲/۱۹۰ تا ۱۹۱) (۱۵) سفر ایوب (Book of Job) پروٹسٹنٹ (Protestant) بائبل کے عہد عتیق (Old Testament) کا اٹھارہواں اور کاثولیکی (Catholic) بائبل کے عہد عتیق کا بائیسواں صحیفہ ہے۔ اس کا عہد تصنیف دسویں صدی قبل مسیح اور مصنف نامعلوم ہے۔ بہت سے علماء مسیحیین کے نزدیک یہ کتاب الحاقی ہے۔ اس کے باوجود اس کی زبان اور تمثیلیت کو انگریزی ادب کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک مثالی صبر کا تعلق ہے اس میں حضرت ایوب علیہ السلام کا کردار مایوس کن ناکامی کا شکار ہے۔ بیالیس ابواب پر مشتمل یہ طویل نظم بہ جائے صبر ایوب کو نمایاں کرنے کے شکوۂ ایوب کی ترجمان ہے۔ اگر قرآن نے صبر ایوب کو نمایاں نہ کیا ہوتا تو علمائے بائبل کے بلند بانگ دعووں کے باوجود حضرت ایوبؑ کی سیرت کا یہ عظیم ترین پہلو نمایاں نہیں ہوسکتا تھا (۱۶) شعب ابی طالب کی تفصیلات کے لیے دیکھیے البدایہ والنہایہ ۳/۶۹، الرحیق المختوم ص ۱۷۲، رحمۃ للعالمین ۱/۶۴، ابن ہشام (اردو) جلد اول باب ۵۴ (۱۷) الرحیق المختوم ص ۲۰۱، البدایہ والنہایہ ۳/۱۰۸، رحمۃ للعالمین ۱/۶۶، ابن ہشام (اردو) ۱/۴۶۹ تا ۴۷۰ (۱۸) الرحیق المختوم ص ۲۰۲ تا ۲۰۳، البدایہ والنہایہ ۳/۱۰۸ تا ۱۰۹، رحمۃ للعالمین ۱/۶۶ تا ۶۷، بخاری: بدء الخلق، مسلم: الجہاد (۱۹) مریم: ۴۷ (۲۰) بائبل کے بیان کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس تھی (پیدائش ۱۶:۱۶) (۲۱) حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کو معاف کر دینے کا ذکر بائبل میں بھی ہے، لیکن محل دوسرا ہے۔ نیز اس کے الفاظ خوف خداوندی سے خالی ہیں (ملاحظہ ہو پیدائش ۵۰: ۱۴ تا ۲۱) (۲۲) الرحیق المختوم ص ۶۳۳، تاریخ اسلام از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (ناز پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی) ۱/۱۸۵ (۲۳) ابن ہشام (اردو) ۲/۴۸۹، البدایہ والنہایہ ۴/۲۴۱، تاریخ اسلام نجیب آبادی ۱/۱۸۵ (۲۴) ابن ہشام (اردو) ۲/۶۲۲ (۲۵) رحمۃ للعالمین ۱/۱۳۶، مولانا نجیب آبادی نے بھی یہی مقدار لکھی ہے۔ تاریخ اسلام ۱/۱۹۲ (۲۶) الرحیق المختوم ص ۶۷۲ (۲۷) صدقات کی یہ تفصیل الرحیق المختوم ص ۶۷۳ سے لی گئی ہے۔ (۲۸) مسند طیالسی ص ۸۲ (۲۹) الصافات: ۱۰۲ تا ۱۰۸، البدایہ والنہایہ ۱/۱۴۸ تا ۱۵۰، قصص القرآن ۱/۲۲۵ تا ۲۴۰ (۳۰) البدایہ والنہایہ ۱/۱۷۷، بائبل حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتی ہے "ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اس سے کہا 'اے ابرہام!' اس نے کہا 'میں حاضر ہوں۔' تب اس نے کہا 'کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا'۔" (پیدائش ۲۲: ۱ تا ۲) اس میں داخلی

تضاد نمایاں ہے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے فرزند ہو ہی نہیں سکتے تھے کیوں کہ ان کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ سو برس کے تھے۔ (پیدائش ۲۱:۵) جب کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش اس وقت ہوئی تھی جب حضرت ابراہیمؑ چھیاسی سال کے تھے۔ (پیدائش ۱۶:۱۶) یہودیوں نے ذبح کی فضیلت سے حضرت اسمٰعیلؑ کو محروم کرنے کے لیے توریت کے الفاظ میں بھی تحریف کی اور لفظ ''مروہ'' کو ''موریاہ'' سے بدل دیا۔ اس موضوع پر دیکھیے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی کتاب ''ذبیح کون ہے؟'' فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ (البقرہ: ۵۹) ''پس بدل ڈالا ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے۔'' (۳۱) یہ قصہ بائبل کی کتاب ۲ سموئیل کے باب ۱۲ میں بہ تفصیل مذکور ہے، جس میں اوریاہ حتی کی بیوی بت سبع کے ساتھ زبردستی کی مثال اور اس سے برے نتائج کی دھمکی دی گئی ہے (آیت ۱۱)۔ نبیوں کی طرف ایسے شرم ناک قصوں کا انتساب مسلم علماء کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو قصص القرآن ۲/۴۷ تا ۵۷ نیز البدایہ والنہایہ ۲/۱۱) (۳۲) اس قصہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے تفہیم القرآن ۳/۱۷۳، حاشیہ ۷۰ سورۃ الانبیاء، نیز قصص القرآن ۲/۷۲ تا ۷۳، البدایہ والنہایہ ۲/۲۱ (۳۳) البدایہ والنہایہ ۲/۲۱، بخاری: الانبیاء۔ الفرائض، مسلم: الاقضیہ، نسائی: آداب القضاۃ، نیز مسند احمد بن حنبل۔ بائبل میں یہ قصہ سلاطین ۳:۱۶ تا ۲۷ بیان ہوا ہے لیکن احادیث اور بائبل کی تفصیلات میں فرق ہے (۳۴) البدایہ والنہایہ ۲/۲۳۸، ابن ہشام (اردو) ۱/۲۲۰، رحمۃ للعالمین ۱/۴۴، الرحیق المختوم ص ۹۴ تا ۹۵، تاریخ اسلام نجیب آبادی ۱/۸۶ (۳۵) حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات کے لیے دیکھیے البدایہ والنہایہ ۱/۱۶۸ تا ۱۷۶، قصص القرآن ۱/۳۴۳ تا ۳۵۶ (۳۶) رحمۃ للعالمین ۱/۴۳، الرحیق المختوم (هـذا الامين رضينـاه) ص ۹۴، ابن ہشام (اردو) ۱/۲۲۰، قصص النبیّن ۴/۲۶۷، نجیب آبادی ۱/۸۳، البدایہ والنہایہ ۲/۲۳۴ نیز (دعوة الامين) ۲/۲۳۸ (۳۷) حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہا السلام کے درمیان التباس واقع ہوا ہے۔ بعض لوگ دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ زمانہ بعثت کے معاملہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض لوگ آپؑ کو انبیاء بنی اسرائیل میں کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک آپؑ کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام سے قبل کا ہے۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ بائبل میں جن صاحب کا نام حنوک (Enoch) ہے وہ آپ ہی ہیں۔ لیکن بائبل میں حنوک نام کے دو افراد ہیں، ایک قائن (قابیل) کا بیٹا (پیدائش ۴:۱۷) دوسرے ابن یارد (پیدائش ۵:۱۸)۔ اسی دوسرے حنوک یا اخنوخ کو مسلمان مؤرخین نے حضرت ادریس علیہ السلام قرار دیا ہے۔ حکماء اور فلاسفہ انھیں کو ہرمس (Hermes) بھی قرار دیتے ہیں۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے قصص القرآن ۱/۸۹ تا ۱۰۱، البدایہ والنہایہ ۱/۱۰۲ تا ۱۰۳، عیون الانباء فی طبقات الاطباء (اردو ترجمہ سی۔ سی۔ آر۔ یو۔ ایم، نئی دہلی) باب اول ۱/۴۴ تا ۵۵ (۳۸) خلیفہ کے معنی متعین کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن کثیرؒ نے اس کے معنی جانشین کیے

ہیں (دیکھیے تفسیر ابن کثیر، آیت نمبر ۳۰ سورۃ البقرہ) نیز البدایہ والنہایہ میں تفصیلی بحث اور سورۂ انعام کی آیت ۱۶۵ سے استدلال)، جب کہ دیگر علماء نے اس سے نائب مراد لیا ہے اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ سے استدلال کیا ہے (۳۹) البدایہ والنہایہ ۱۴۱/۳، ابن ہشام (اردو) ۵۳۵/۱، رحمۃ للعالمین ۹۱/۱، الرحیق المختوم ص ۲۶۹ تا ۲۷۰، تاریخ اسلام (نجیب آبادی) ۱۱۹/۱ (۴۰) تاریخ اسلام (نجیب آبادی) ۸۳/۱ (۴۱) علامہ شوکانیؒ ان الفاظ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ ''یہ دونوں الفاظ رحمت سے مشتق ہیں لیکن رحمٰن مبالغہ میں رحیم سے بڑھا ہوا ہے، نیز رحمٰن کی صفت غیر اللہ کے لیے استعمال نہیں ہوتی''۔ (نفحۃ العبیر من زبدۃ التفسیر، دار السلام ص ۷) مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رحمٰن صفت مقداری انفجاری ہے اور رحیم صفت مقداری استمراری۔ (ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد اول، تفسیر بسملہ) (۴۲) ابو داؤد: الخراج والامارہ والفیٔ (۴۳) بخاری: الدیات، ابن ماجہ: الزہد (۴۴) بخاری و مسلم، بحوالہ تفہیم القرآن ۱۰/۳ (۴۵) القرآن، مریم: ۴۱ تا ۴۸ (۴۶) اس حدیث کا پہلا حصہ ابن ماجہ کتاب الادب میں حضرت ابی ابن کعب اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور دوسرا حصہ بخاری، کتاب الطب، ابوداؤد کتاب الادب اور مؤطا امام مالک میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں بھی یہ حدیث موجود ہے (۴۶ الف) الرحیق المختوم، ۱۹۸۷ء، ص ۷۵۷ (۴۷) تلخیص تفہیم القرآن ص ۴۴۹ (۴۸) تلخیص تفہیم القرآن ص ۴۴۹، علامہ شوکانی کی زبان میں ''ای بالطریق التی ھی احسن طرق المجادلہ۔'' (فتح القدیر من نفحۃ العبیر ص ۶۷۱ تا ۶۷۲ (۴۹) تلخیص تفہیم القرآن، النحل، حاشیہ ۵۵ ص ۴۳۸ (۵۰) حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ دین حق کی تلاش میں عرصہ تک سرگرداں رہے۔ یہاں تک کہ آں حضرت ﷺ کے سفر ہجرت میں قبا کے مقام پر آپؓ کو اسلام قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ نے غلامی سے گلوخلاصی کے لیے اپنے مالک سے تین سو کھجور کے تیار درخت اور چالیس اوقیہ سونا کے عوض مکاتبت کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے تعاون سے یہ شرط پوری کرادی اور آپؓ آزاد ہو گئے۔ بحوالہ ابن ہشام (اردو) ۲۴۳/۱ تا ۲۴۴ (۵۱) ابن ہشام (اردو) ۲۴۷/۱ تا ۲۴۹ (۵۲) الرحیق المختوم ص ۱۱۵ تا ۱۱۶، رحمۃ للعالمین ۴۹/۱، ابن ہشام ۲۶۷/۱، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۳؛ سیرت ابوبکر صدیقؓ۔ سعید احمد اکبر آبادی ص ۵؛ تاریخ اسلام ۹۰/۱؛ البدایہ والنہایہ ۲۰/۳ تا ۲۲۔ صرف مبارک پوری نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ تمام حضرات وحی و انذر عشیرتك الاقربین، (الشعراء: ۲۱۴) ''اپنے قریبی اعزہ کو ڈرایئے'' کے بعد ایمان لائے ہیں، ورنہ اور لوگوں کی تحریروں سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ اول الاسلام لوگ مذکورہ وحی کے نازل ہونے سے پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ واللہ اعلم (۵۳) رحمۃ للعالمین ۵۲/۱؛ الرحیق المختوم ص ۱۲۰؛ البدایہ والنہایہ ۱۳۲/۳ (۵۴) یہ واقعات سیرت کی تمام کتابوں میں مرقوم ہیں (۵۵) مریم: ۴۱ تا ۴۸ (۵۶) التحریم: ۱۰ (۵۷) التحریم: ۱۱ تا ۱۲ (۵۸) ہود: ۴۲ تا ۴۳ نیز ۴۵ تا ۴۶ (۵۹) النمل

:۱۲؛ القصص:۳۳؛ الشعراء:۱۰؛ طٰہٰ:۴۰، ۴۳؛ النازعات:۸۵تا۸۶ وغیرہ (۶۰) تلخیص تفہیم القرآن، سورۃ القلم، حاشیہ ۳۱ ص ۸۸۷ (۶۱) تلخیص تفہیم القرآن، ص، ۴۳۴ (۶۲) صدیق اکبر (اکبر آبادی) ص: ۶۰ و ۶۱، رحمۃ للعالمین ۱/۲۵۱-۲۵۲، ابن ہشام (اردو) ۲/۸۰۱ و ۸۰۸، الرحیق المختوم۔ ص ۲۳۵، تاریخ اسلام (نجیب آبادی) ۱/۲۰۴، بخاری: کتاب الحدود، طبقات ابن سعد، مسند احمد، ابن ہشام ص ۱۰۱۹ (۶۳) فضائل صحابہ کے تمام نکات حدیث کے مندرجہ ذیل مجامع سے ماخوذ ہیں: بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، موطا امام مالک، مسند طیالسی، مسند زید بن علی، مسند احمد بن حنبل، مغازی واقدی نیز سیرت ابن ہشام۔ حدیث کی کتابوں میں بعض بعض فضائل کئی کئی ابواب میں ہیں (۶۴) بحوالہ تفہیم القرآن ج دوم، مقدمہ سورۃ التوبہ (۶۵) رحمۃ للعالمین ۲/۱۵۵ (۶۶) ثرید عربوں میں لذیذ ترین کھانا سمجھا جاتا تھا جو روٹی اور شوربہ کا آمیزہ ہوتا تھا (۶۷) بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد، طیالسی (ابنی هذا سید و لعل اللّٰه ان یصلح به بین فئتین عظیمتین) (۶۸) ابوداؤد۔ کتاب السنۃ ۴:۴۶۴۶ ص ۲۱۱، داراحیاء السنۃ النبویہ (۶۹) قصص القرآن ۴/۳۶۴ (۷۰) ایضاً ص ۳۷۲ (۷۱) یہ حدیث صحاح ستہ کے بہت سے ابواب کے علاوہ مسند احمد میں بھی ہے (۷۲) الرحیق المختوم ص ۱۴۱ و ۱۴۳ (۷۳) البدایہ والنہایہ ۳/۵۳ (۷۴) قرآن کریم میں سورۂ نوح کے علاوہ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر سورۂ اعراف، یونس، ہود، انبیاء، شعراء، عنکبوت، صافات، اور قمر میں ہے۔ بائبل میں حضرت نوحؑ کا ذکر پیدائش ۸:۵ سے شروع ہوکر ۹:۲۹ پر ختم ہوتا ہے۔ البدایہ والنہایہ میں ان کا بیان ۱/۱۰۳ تا ۱۱۷ تک ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے قصص القرآن ۱/۶۳ تا ۸۸ میں اس کی تفصیل پیش فرمائی ہے (۷۵) و لکلّ امّة احلٌ، فاذا جآء احلهم لا یستأخرون ساعة وّلا یستقدمون (الاعراف:۳۴) "ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے۔ پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔" (۷۶) حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر نو سورتوں: اعراف، ہود، مؤمنون، شعراء، فصلت (حٰم السجدہ)، احقاف، ذاریات، قمر، الحاقہ میں ہوا ہے۔ البدایہ والنہایہ میں اس کی تفصیلات ۱/۱۱۹ تا ۱۲۷ اور قصص القرآن میں ۱/۱۰۲ تا ۱۲۱ میں مذکور ہیں۔ بائبل میں حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر نہیں ہے اسی لیے مستشرقین آپؑ کا وجود تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن گزشتہ صدی میں حصن الغراب میں جو حجری اثریات دریافت ہوئے ہیں ان میں حضرت ہود علیہ السلام کا واضح طور سے ذکر آتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تاریخ ارض القرآن جلد اول میں امم سامیہ کے باب میں قحطانیوں کے نسب کی پوری تحقیق فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحہ ۱۲۱ تا ۱۳۱۔ بائبل کے سفر تکوین (پیدائش) میں سام کا نسب نامہ باب ۱۰ میں آیات ۲۱ تا ۳۱ بیان ہوا ہے۔ حصن الغراب کے کتبہ کے الفاظ ارض القرآن ۱/۳۲ پر دیکھیں (۷۷) ہودؑ کی طرح بائبل حضرت صالح علیہ السلام اور قوم ثمود کے ذکر سے بھی خالی ہے۔ قرآن کریم کی دس سورتوں میں آپ کا ذکر ہوا ہے: اعراف، ہود، حجر، شعراء، نمل۔

فصلت، نجم، قمر، حاقہ اور الشمس۔ اس قصے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: البدایہ والنہایہ ۱/۱۲۷ تا ۱۳۳ نیز قصص القرآن ۱/۱۲۲ تا ۱۵۰ (۷۸) حضرت لوط علیہ السلام کے قصے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: قصص القرآن ۱/۲۵۶ تا ۲۷۶، نیز البدایہ والنہایہ ۱/۱۶۳ تا ۱۷۰۔ بائبل کی کتاب پیدائش کے ابواب ۱۸ و۱۹ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا حضرت لوط علیہ السلام کے پاس جانے اور سدوم اور عمورہ کی بستیوں کے مبتلائے عذاب ہونے کا بہ تفصیل ذکر ہے۔ اگر اس قصے میں حضرت لوط علیہ السلام سے منسوب قبائح کو خارج کر دیا جائے تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے پیغمبرانہ کردار کی مناسب تصویر حاصل ہوتی ہے (۷۹) قرآن کریم میں حضرت شعیب علیہ السلام کا تذکرہ سورۂ اعراف، ہود، شعراء اور عنکبوت میں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کا تذکرہ ۱/۱۷۰ تا ۱۷۶ میں کیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے بھی قصص القرآن میں ۱/۳۴۳ تا ۳۵۶ ان کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین نے انھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر بتایا ہے جن کی صاحب زادی آپ کی زوجیت میں آئیں (قصص القرآن ۱/۳۸۷)۔ یہی بات علامہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت حسن بصریؒ کے حوالہ سے نقل کی ہے (۱/۲۱۸)۔ لیکن ان روایات کی اسناد محل نظر ہے۔ بائبل کتاب خروج ۲:۱۸ میں موسیٰ علیہ السلام کے خسر کا نام رعوائیل اور ۳:۱ میں یترو لکھا ہے، اور دونوں جگہ انھیں مدیان کا کاہن بتلایا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ اسی لفظ یترو سے شعیب کو معرب بتلاتے ہیں۔ یترو یا حوباب (حضرت شعیبؑ) خسر موسیٰؑ (تاریخ ارض القرآن۔ مطبع معارف ۱/۱۰۰) حافظ ابن کثیرؒ نے مسند بزار کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کا قول ہے: ''نوحؑ سے تین اولاد ہوئی: سام، حام اور یافث۔ سام کی اولاد ہیں عرب، فارس اور روم، ان میں خیر ہے۔ یافث کی اولاد میں، یاجوج، ماجوج، ترک اور سقالبہ ہیں، ان میں خیر نہیں ہے۔ حام کی اولاد ہیں، قبط، بربر اور سودان۔'' شاید یہ حدیث دوسرے طریقوں سے بھی مروی ہے کیوں کہ حافظ بزار نے یہ بھی کہا ہے کہ اس ایک کے علاوہ کسی اور طریقے میں رفع نہیں ہے (البدایہ والنہایہ ۱/۱۱۵)۔ اس حدیث کے متن میں غرابت ہے کیوں کہ اس میں مدار خیر، نسل کو بتایا گیا ہے نہ کہ عمل کو۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جب کشتی میں حضرت نوحؑ اور ان کے خاندان کے علاوہ دوسرے مومنین بھی تھے تو کیا ان سے کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی؟ (۸۰) پیدائش ۹:۱۸، ۱۹ (۸۱) الاعلیٰ: ۱۹ (۸۲) پیدائش ۱۶:۱۵، ۲۱:۳؛ الصافات: ۱۰۰ تا ۱۰۱، ابراہیم: ۳۹ (۸۳) مسجد حرام کا اولین مسجد ہونا اور مسجد اقصیٰ کا مسجد حرام سے چالیس سال بعد تعمیر ہونا، بخاری: الانبیاء، مسلم: المساجد، ابن ماجہ: المساجد والجماعات، نیز مسند احمد اور طیالسی: حدیث نمبر ۴۶۲ میں ہے (۸۴) بائبل میں ہے ''اور وہ کسدیوں کے اُر سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہیں رہنے لگے'' (پیدائش ۱۱:۳۱) (۸۵) پیدائش ۱۲:۷ تا ۸۔ بائبل میں حکم خداوندی کے صریح الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ ''تب خداوند نے ابرام کو

دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔'' (۸۶) دوسری قربان گاہ بیت ایل کے مشرق میں تھی (۸۷) یہ مقام آج کل ''الخلیل'' کہلاتا ہے۔ یہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری آرام گاہ ہے۔ اب یہ شہر فلسطینی مقتدرہ کے زیر انتظام ہے (۸۸) پیدایش ۱۹:۹ تا ۱۱، اس کی تفصیلات سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۰ میں بیان کردہ تفصیلات سے بالکل الگ ہیں۔ یہاں اس واقعہ کے ذکر سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ بائبل میں بہت سے کام جو بے مقصد یا بے فیض نظر آتے ہیں، قرآن ان کے اخلاقی، روحانی، تعبدی اور ایمانی پہلو سے بحث کرتا ہے، جس سے اس فعل کا مقصد معلوم و متعین ہو جاتا ہے (۸۹) یوسف علیہ السلام کا خواب اور اس کی تکمیل (یوسف: ۳۷:۷) (۹۰) یوسف: ۳۹ تا ۴۰ (۹۱) پیدائش ۴۱: ۴۰ تا ۴۲ (۹۲) پیدائش ۴۱: ۴۴ (۹۳) پیدائش ۴۷: ۲۶ (۹۴) **فیما سقت السماء العشر و ما سقی بالنضح نصف العشر** ۔ یہ حدیث مسند احمد کے علاوہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور موطا امام مالک کی کتاب الزکوٰۃ میں موجود ہے (۹۵) پیدائش ۴۶: ۲۶ تا ۲۷۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں میں عورتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیوں کہ سفر خروج میں بھی صرف مردوں ہی کی تعداد بتلائی گئی ہے۔ جو لوگ اسلام میں عورتوں کی حق تلفی کا مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں، اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ ان کے یہاں عورتوں کو شاید ہی کہیں انصاف دیا گیا ہے (۹۶) خروج ۱۲: ۳۷ تا ۳۸، نیز دیکھیے: تفہیم القرآن ۲/۴۳۰ حاشیہ ۶۸ (۹۷) خروج ۱۲: ۴۰ تا ۴۱ (۹۸) حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر پہنچنے کے وقت وہاں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کی حکومت تھی جو اصلاً عرب تھے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک حکمرانوں کا خاندان تبدیل ہو چکا تھا۔ (اس نسلی بحث کے لیے دیکھیے تاریخ ارض القرآن ۱/۱۵۰ تا ۱۵۹ نیز تفہیم القرآن ۲/۶۴ حاشیہ ۸۵ (۹۹) خروج ۱: ۸ تا ۱۰ نیز ۳: ۲۳ تا ۲۵ میں بنی اسرائیل کی فریادیوں نقل ہوئی ہے ''اور ایک مدت بعد یوں ہوا کہ مصر کا بادشاہ مر گیا اور بنی اسرائیل اپنی غلامی کے سبب سے آہ بھرنے لگے اور روئے۔ اور ان کا رونا جو ان کی غلامی کے باعث تھا خدا تک پہنچا۔ اور خدا نے ان کا کراہنا سنا۔ اور خدا نے اپنے عہد کو جو ابرہام اور اضحاق اور یعقوب کے ساتھ کیا تھا یاد کیا۔ اور خدا نے بنی اسرائیل پر نظر کی اور ان کے حال کو معلوم کیا۔'' (۱۰۰) خروج باب ۳ نیز ۴: ۱ تا ۱۷۔ تفویض رسالت کی داستان اکثر جگہ قرآن کے مطابق ہے۔ لیکن قرآن اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ آگ کا شعلہ مدین سے قریب حورب میں ظاہر ہوا تھا (خروج ۳: ۱ تا ۲)۔ اس کے برخلاف قرآن بتلاتا ہے کہ آگ کا شعلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طویٰ میں نظر آیا تھا اور وہیں سے آپ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ہوا تھا (طٰہٰ: ۹ تا ۴۶) (۱۰۱) خروج ۲۰: ۳ تا ۵۔ الشعراء: ۶۵، البقرہ: ۵۰ (۱۰۲) البقرہ: ۵۳ بائبل کا بیان اس بارے میں قرآن کے بیان سے مختلف ہے کیوں کہ بائبل کے مطابق موسیٰ علیہ السلام ایک بار پھر اپنے خسر یترو سے ملتے ہیں۔ اللہ سے گفتگو اور احکام کے نزول کا بیان سفر خروج کے باب ۲۰ سے شروع ہوتا ہے (۱۰۳) خروج ۲۰: ۳ تا ۵ (۱۰۴) المائدہ: ۴۵ (۱۰۵) البقرہ

:۵۴۔ توریت کا بیان ملاحظہ ہو''اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق عمل کیا، چناں چہ اس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے'' (خروج ۳۲ :۲۸)۔ حافظ ابن کثیر اور علامہ شوکانی نے مقتولین کی تعداد ستر ہزار بیان کی ہے (بحوالہ تفسیر احسن البیان، بذیل آیت البقرہ:۵۴) (۱۰۶) بخاری: المغازی، الدیّات، استتابۃ المرتدین، الاحکام؛ مسلم: القسامہ، الامارۃ؛ ابوداؤد: الحدود؛ ترمذی: الدیات، الحدود، الفتن؛ نسائی: تحریم الدم، القسامہ؛ ابن ماجہ: الحدود، نیز مسند احمد اور مسند طیالسی ح ۲۶۸۹ (۱۰۷) استثنا ۳۴: ۴ تا ۵ (۱۰۸) بائبل میں ہے''اور بنی اسرائیل نے جلجال میں ڈیرے ڈال دیے اور انھوں نے یریحو (موجودہ نام جیریکو Jerico جواب فلسطینی مقتدرہ کے زیر انتظام ہے) کے میدانوں میں اسی مہینے کی چودھویں تاریخ کو شام کے وقت عید فسح منائی اور عید فسح کے دوسرے دن اسی ملک کے پرانے اناج کی بے خمیری روٹیاں اور اسی روز بھنی ہوئی بالیں کھائیں۔ اور دوسرے ہی دن سے ان کے اس ملک کے پرانے اناج کے کھانے کے بعد منّ موقوف ہو گیا، اور آگے پھر بنی اسرائیل کو منّ کبھی نہ ملا۔ لیکن اس سال انھوں نے ملک کنعان کی پیداوار کھائی۔'' (یشوع ۵: ۱۰ تا ۱۲) (۱۰۹)''اور نون کا بیٹا یشوع دانائی کی روح سے معمور تھا کیوں کہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اس پر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل اس کی بات مانتے رہے۔ اور جیسا خداوند نے موسیٰ کو حکم دیا تھا انھوں نے ویسا ہی کیا۔'' (استثنا ۳۴: ۹) (۱۱۰) زبور ۱۴۹: ۶ تا ۹۔ واضح رہے کہ بائبل کا انداز ہمیشہ تمثیلی ہوا کرتا ہے، اس لیے ان کو لفظی یا حقیقی معنوں میں نہ لینا چاہیے۔ یہ بھی واضح رہے کہ بائبل کے مجموعے میں شامل کتاب زبور (Psalms) کی تصنیف میں خود عیسائی علماء کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کے علاوہ دیگر بہت سے مصنفین شامل ہیں، اور اس کا زمانہ تصنیف دسویں صدی عیسوی اور مابعد کا زمانہ ہے۔ اس کے باوجود پوری بائبل کو الہامی کتاب کہا جاتا ہے (۱۱۱) انجیل یوحنا ۱: ۱۹ تا ۲۷ (۱۱۲) مکاشفات یوحنا ۱۹: ۱۱ تا ۱۶۔ مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے اس مکاشفہ کی بہت عمدہ تشریح فرمائی ہے، ملاحظہ ہو رحمۃ للعالمین ۱/۴۴ تا ۴۶ بر حاشیہ۔ یہ بشارت برناباس کی انجیل میں نام کے ساتھ مذکور ہے۔''یسوع نے جواب دیا''اس مسیح کا نام قابل تعریف ہے کیوں کہ خود خدا نے اس کا یہ نام رکھا، جب اس نے اس کی روح پیدا کی اور اسے ملکوتی شان میں رکھا' خدا نے کہا' محمد انتظار کر، کیوں کہ میں تیری خاطر بہشت، دنیا اور بڑی تعداد میں مخلوق پیدا کیا چاہتا ہوں، جن کو میں تجھے تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ جو تجھے مبارک کہے گا مبارک ہوگا اور جو تجھے کوسے گا لعنتی ہوگا۔ جب میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا تو اپنا رسول نجات بنا کر بھیجوں گا، اور تیرا کلام سچا ہوگا، یہاں تک کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے، پر تیرا دین نہ ٹلے گا۔'' (برناباس کی انجیل، اردو ترجمہ از آسی ضیائی، مکتبہ اسلامی، دہلی باب ۹۷ صفحہ ۱۴۴)۔ نام کی صراحت کے ساتھ دیگر کئی مقامات پر یہ پیش گوئیاں مرقوم ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر بھی نہیں آئے تھے۔ فرماتے ہیں''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیوں کہ میں تم

سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا، جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے''۔ (انجیل متیٰ ۵:۱۷ تا ۱۸) لیکن موجودہ عیسائیت حضرت مسیح علیہ السلام کا لایا ہوا دین نہیں ہے بلکہ ایک دشمن مسیح، سینٹ پولس (Saint Paul) کا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے بعد دین مسیح کا ٹھیکیدار بن گیا تھا، مسخ کیا ہوا دین ہے۔ اس بات کا خود عیسائیوں کو اعتراف ہے کہ وہ عیسیٰ مسیحؑ کی پیروی نہیں کرتے بلکہ سینٹ پال کی پیروی کرتے ہیں، جس نے دین کو آسان اور ان کی خواہشات نفس کے مطابق بنا دیا۔ موجودہ عہد نامۂ جدید میں اناجیل اربعہ کے بعد سینٹ پال کے کئی خطوط ہیں۔ ان خطوط میں اس نے کہیں شریعت موسوی کا انکار کیا ہے، کہیں انھیں بے فیض اور کار دنیاداری بتایا ہے اور کہیں فرسودہ اور پامال شریعت کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، جس کی ضرورت اب باقی نہیں ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے ''کیوں کہ جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ لعنت کے ماتحت ہیں، چناں چہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا وہ لعنتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلہ سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راست باز نہیں ٹھیرتا کیوں کہ لکھا ہے کہ راست باز انسان جیتا رہے گا، اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں'' (گلتیون کے نام سینٹ پال کا خط ۳: ۱۰ تا ۱۲)۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتا ہے ''دیکھو میں پولس تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم ختنہ کراؤ گے تو مسیح سے تم کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا بلکہ میں ہر ایک ختنہ کرانے والے شخص پر پھر گواہی دیتا ہوں کہ اسے تمام شریعت پر عمل کرنا فرض ہے۔ تم جو شریعت کے وسیلہ سے راست باز ٹھہرنا چاہتے ہو مسیح سے الگ ہو گئے اور فضل سے محروم۔'' (گلتیون ۵:۲ تا ۳) عبرانیون کے نام خط میں کہتا ہے ''جب اس نے نیا عہد کیا تو پہلے کو پرانا ٹھیرایا اور جو چیز پرانی اور مدت کی ہو جاتی ہے وہ مٹنے کے قریب ہوتی ہے۔'' (عبرانیوں کے نام پولس کا خط ۸:۱۳) (۱۱۳) استثنا ۱۸:۱۵ نیز ۱۸ تا ۱۹ (۱۱۴) استثنا ۳۳:۲ (۱۱۵) بخاری: الایمان، تفسیر القرآن؛ مسلم: الایمان؛ نسائی: الایمان وشرائعہ، نیز مسند احمد (۱۱۶) شھادة اھل الکتاب بعضھم علی بعض (ابن ماجہ: الاحکام) (۱۱۷) بخاری: الجنائز (۱۱۸) بخاری: الحج، مسلم: الحج، ابن ہشام (اردو) ۲/۴۴۷ (۱۱۹) مسلم: الحج (۱۲۰) بخاری باب الخطبہ، ایام منیٰ ۱/۳۳۴، مسلم: الحج (۱۲۱) منازعت بین الناس کے درمیان یہ بات کہی گئی ہے کہ ''لیکن اگر نقصان ہو جائے تو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ'' (خروج ۲۱:۲۳ تا ۲۵)۔ توریت کے قانون میں برابری کے درجہ والوں میں خوں بہا نہیں ہے۔ ہاں لونڈی، غلاموں کے بارے میں ایک الگ قانون بیان کیا گیا ہے، ''اور اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھی سے ایسا مارے کہ وہ اس کے ہاتھ سے مر جائے تو اسے ضرور سزا دی جائے، لیکن اگر وہ ایک دو دن جیتا رہے تو آقا کو سزا نہ دی جائے اس لیے کہ وہ غلام اس کا مال ہے'' (خروج ۲۱:۲۰ تا ۲۱)۔ اسلام نے اس قانون قصاص میں چند

ترامیم کی ہیں۔ایک تو خوں بہارائج کیا، دوسرے صدقہ کے ذریعہ معافی کا دروازہ کھول دیا، اور تیسرے آگ سے جلانے کی ممانعت کردی۔(۱۲۲) جیسا کی ازواج مطہراتؓ کو تنبیہ کی گئی ہے: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ط (الاحزاب:۳۰) ''اے نبیؐ کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دہرا دہرا عذاب دیا جائے گا۔'' مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے سورۃ المائدہ کے ساتویں رکوع کے حاشیہ میں تحکیم پر اصرار کو جدید مسلک اعتزال سے تعبیر کیا ہے۔ان کے نزدیک کفر، ظلم اور فسق کی اصطلاحات جو سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴، ۴۵، ۴۷ میں استعمال ہوئی ہیں وہ یہودیوں کے لیے خاص ہیں۔ان اصطلاحات کا استعمال مسلمانوں کے لیے درست نہیں ہے۔مولانا دریابادیؒ کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں ''یہ کفر، ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی میں داخل ہیں۔ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔البتہ جس طرح انحراف کے درجات و مراتب میں فرق ہے اسی طرح ان تینوں چیزوں کے مراتب میں فرق ہے۔جو شخص حکم الٰہی کے خلاف اس بنا پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو غلط اور اپنے یا دوسرے انسان کے حکم کو صحیح سمجھتا ہے وہ مکمل کافر اور ظالم اور فاسق ہے، اور جو اعتقاداً حکم الٰہی کو برحق سمجھتا ہے مگر عملاً اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ اگرچہ خارج از ملت تو نہیں ہے مگر اپنے ایمان کو کفر، ظلم اور فسق سے مخلوط کر رہا ہے۔اسی طرح جس نے تمام معاملات میں حکم الٰہی سے انحراف اختیار کرلیا ہے وہ تمام معاملات میں کافر، ظالم اور فاسق ہے، اور جو بعض معاملات میں مطیع اور بعض معاملات میں منحرف ہے اس کی زندگی میں ایمان واسلام اور کفر و ظلم وفسق کی آمیزش ٹھیک ٹھیک اسی تناسب کے ساتھ ہے، جس تناسب کے ساتھ اس نے اطاعت اور انحراف کو ملا رکھا ہے۔بعض اہل تفسیر نے ان آیات کو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کلام الٰہی کے الفاظ میں اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔اس تاویل کا بہترین جواب وہ ہے جو حضرت حذیفہؓ نے دیا ہے۔ان سے کسی نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں۔اس پر حضرت حذیفہ (بن یمانؓ) نے فرمایا ''کتنے اچھے ہیں تمھارے لیے یہ بنی اسرائیل کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لیے۔ہرگز نہیں، خدا کی قسم! تم انھیں کے طریقے پر قدم بہ قدم چلو گے'' (تلخیص تفہیم القرآن، صفحہ ۱۹۶، حاشیہ ۷۷) (۱۲۳) امام دارمیؒ نے اپنی سنن کے مقدمہ باب ۴۸ میں اس پر گفتگو فرمائی ہے کہ الا و ان ما حرم رسول اللہ فھو مثل ما حرم اللہ یعنی ''رسول کی قائم کردہ حرمت اللہ کی قائم کردہ حرمت کے مثل ہے۔'' (۱۲۴) اس موضوع پر خاک سار کا ایک مفصل مضمون ''زندگی نو'' میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔ملاحظہ ہو شمارہ نمبر ۱۲ جلد ۱۴ نیز شمارہ نمبر ۱ جلد ۱۵ برائے دسمبر ۱۹۹۱ء و جنوری ۱۹۹۲ء (۱۲۵) فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (المائدہ:۲۴) ''جاؤ تم اور تمھارا خدا جنگ کرو، ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' بائبل میں ہے ''تب کالب نے موسیٰ

کے سامنے لوگوں کو چپ کرایا اور کہا کہ چلو ہم ایک دم جا کر اس پر قبضہ کریں، کیوں کہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کرلیں۔ لیکن جو اور آدمی اس کے ساتھ گئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں کیوں کہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں''۔ (گنتی ۱۴: ۳۰ تا ۳۱) (۱۲۶) رحمۃ للعالمین مقدمہ ۱/۳۱ تا ۳۲ (۱۲۷) رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۱ تا ۱۰۲، ابن ہشام (اردو) ۱/۴۵۵ تا ۵۶۱ (۱۲۸) رحمۃ للعالمین ۲/۱۸۴ تا ۲۰۲، یہ تفصیلات ابن ہشام میں بھی ملتی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے تمام غزوات میں شہید ہونے والوں کے نام بھی لکھے ہیں (۱۲۹) رحمۃ للعالمین ۱/۱۴۹ تا ۱۶۱، یہ تفصیلات ابن ہشام میں بھی ہیں (۱۳۰) نمرود کو بھی خدائی کا دعویٰ تھا لیکن فرعون کے برخلاف یہ دعوائے الوہیت تھا۔ (۱۳۱) بخاری: فضائل القرآن کے علاوہ یہ حدیث مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، طبرانی وغیرہ میں بھی موجود ہے (۱۳۲) بخاری: الایمان، تفسیر القرآن، مسلم: الایمان، ترمذی: الایمان، نسائی: الایمان وشرائعہ، نیز مسند احمد (۱۳۳) مسند احمد ۲/۳۵۱ (۱۳۴) مسلم: الحج، ابن ہشام (اردو) ۲/۴۳۷، الرحیق المختوم ص ۷۱۴ (۱۳۵) ربٰو کی حرمت کے لیے دیکھیے احادیث بخاری: البیوع، الطلاق، اللباس؛ مسلم: المساقات والمزارعۃ؛ ابوداؤد: البیوع؛ ترمذی: البیوع، تفسیر القرآن؛ نسائی: التطبیق، التربیۃ، نیز مسند احمد؛ ابن ہشام (اردو) ۱/۶۹۸؛ مغازی واقدی ص ۳۳۸، ۴۳۱ (۱۳۶) ترمذی: التفسیر عن ابی حاتم۔ مسند احمد و ابن حبان وغیرہم کی مشہور حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''المغضوب'' یہودی ہیں اور ''الضالین'' نصاریٰ ہیں (بحوالہ ترجمان القرآن۔ ابوالکلام آزادؒ۔ ساہتیہ اکیڈمی ۱/۴۵۴)۔ نیز فتح القدیر از علامہ شوکانیؒ (۱۳۷) ابن ہشام (اردو) ۲/۴۳۹ تا ۴۴۰؛ الرحیق المختوم ص ۶۰۷ (۱۳۸) الرحیق المختوم ص ۳۱۸ پر مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ یا ۳۱۴ یا ۳۱۷ لکھی ہے اور مکی لشکر کی تعداد تیرہ سو۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے کفار کو ایک ہزار اور مسلمانوں کو تین سو تیرہ بتایا ہے۔ (دیکھیے رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۳ تا ۱۰۴) (۱۳۹) ''(جنگ احد میں) مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ایک طرف دشمن تین ہزار ہیں اور ہمارے ایک ہزار میں سے بھی تین سو الگ ہوگئے ہیں تو ان کے دل ٹوٹنے لگے، اس وقت نبی ﷺ نے ان سے یہ الفاظ کہے تھے۔'' (تلخیص تفہیم القرآن، صفحہ ۱۲۰، حاشیہ ۹۶) (۱۴۰) یہاں صبر کا لفظ آزمانے کے لیے استعمال ہوا ہے (۱۴۱) حدیث کی حیثیت سے مشہور ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے 'فتح الباری' میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ کسی کا قول ہے جو حدیث کی حیثیت سے مشہور ہوگیا ہے (۱۴۲) ابن ہشام (اردو): ۱/۱۵۱ (۱۴۳) الرحیق المختوم ص: ۱۷۲ (۱۴۴) الرحیق المختوم ۲۶۷، ابن ہشام ۱/۵۳۹، رحمۃ للعالمین: ۱/۸۲ (۱۴۵) ڈاکٹر حمید اللہ، خطباب بہاولپور (دہلی) ۳۱۴ بحوالہ بلاذری (۱۴۶) ابن ہشام ۱/۶۷، الرحیق المختوم ص: ۲۹۹، رحمۃ للعالمین ۱/۹۵، ۹۶ (۱۴۷) تلخیص تفہیم القرآن ص ۱۰۳۸ (۱۴۸) ڈاکٹر حمید اللہ۔ خطبات ۲۶۶ (۱۴۹) بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، ابن ہشام (۱۵۰) ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات ۲۸۲ (۱۵۱) بخاری بحوالہ الرحیق المختوم ۴۸۷ (۱۵۲) مسلم

(۱۵۳) الاعراف: ۱۶۳-۱۶۵ (۱۵۴) بخاری (۱۵۵) الانفال: ۶۸ (۱۵۶) مسلم، مسند احمد (۱۵۷) الجہاد فی الاسلام، باب سوم (۱۵۸) دفاع کی یہ چھ صورتیں الجہاد فی الاسلام کے باب دوم سے مستفاد ہیں (۱۵۹) رحمۃ للعالمین ۲/۲۰۰ (۱۶۰) رحمۃ للعالمین ۲/۲۱۴ تا ۲۳۲ (۱۶۱) رحمۃ للعالمین ۲/۲۱۱ (۱۶۲) حمید اللہ۔ خطبات ۲۸۶ (۱۶۳) بخاری بہ روایت زید بن ارقم بحوالہ رحمۃ للعالمین (۱۶۴) بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶ (یہ احادیث صحاح ستہ کی تمام کتب میں ہیں) (۱۶۵) بائبل کتاب استثنا ۷:۱ تا ۵ (۱۶۶) استثنا ۲۵: ۱۹ (۱۶۷) یشوع ۸:۸،۸: ۱۹ تا ۲۹ (۱۶۸) قضاۃ: ۱:۵ (۱۶۹) قضاۃ ۳: ۲۹ (۱۷۰) قضاۃ: ۲۱: ۱۰ (۱۷۱) ۲ سموئیل ۸: ۲ (۱۷۲) ۲ سموئیل ۸: ۱۳ و ۱۴ (۱۷۳) سلاطین ۲: ۲۴ (۱۷۴) ۲ سلاطین: ۲۰: ۳۵ (۱۷۵) بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۲۲۳۔ (یہ احادیث صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں) (۱۷۶) رحمۃ للعالمین ۲/۲۱۱ (۱۷۷) خطبات بہاولپور ۲۴۳۔
